کیا مسافر تھے!

عرفان خلیلی

کارواں موجِ رواں، سیل رواں ہو جاتا

اس میں شک نہیں کہ آلام و مصائب کو دعوت دینا اور ابتلا و آزمائش کی خواہش کرنا کوئی مستحسن امر نہیں ہے۔ ایک مسلمان کو تو اس قسم کی آرزو کرنے سے منع بھی کیا گیا ہے۔ لیکن ـــــ یہ بھی ایک حقیقت ہے ـــــ کہ منزلِ مراد تک پہنچنے کے لیے اس سے مفر بھی نہیں۔ راہِ رضا پر قدم رکھتے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طرح طرح کی آزمائشیں اور قسم قسم کے آلام جیسے ہمارے منتظر ہی ہوں۔ سب سے پہلے ہمارا خیر مقدم کرنے کے لیے وہی آگے بڑھتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو واقعہ بھی یہی ہے کہ جب تک اس خارزار سے نہ گزرا جائے، اس بھٹی میں نہ تپا جائے ـــــ عزم میں پختگی، رفتار میں تیزی اور قدم میں جماؤ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ سچ ہے۔

تو بھی عجیب چیز ہے اے ابتلائے دہر
پختہ نہ ہو سکا کوئی انساں ترے بغیر

تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ جب بھی کسی دل کی گہرائی سے، پورے شعور کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کی آواز اُٹھی تو اس کا استقبال کبھی طوق و سلاسل سے کیا گیا تو کبھی دار و رسن سے، کبھی آرے نے بڑھ کر اُسے دو نیم کر دیا تو کبھی لوہے کی کنگھیوں نے اس کے جسم کا قیمہ بنا دیا، کبھی کوڑے کی ضربوں نے اس کے بدن کو چوما تو کبھی بجلی کے کرنٹ نے اس کے تنِ مردہ میں ایک ہیجان سا پیدا کر دیا۔ غرض کہ اس کے اِس دعوے کا ثبوت طرح طرح سے طلب کیا گیا اور جب وہ اپنے اس امتحان میں کامیاب ہو گیا تو پھر ـــــ امتحان لینے والے کی نوازشوں نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ خواہ ظاہر بیں نظروں نے اُسے خسرانِ مبین ہی کیوں نہ کہا ہو مگر ـــــ وہ

مطمئن ہو گیا ــــ کیوں کہ جس کی رضا کے لیے اُس نے یہ سارے پاپڑ بیلے تھے اس نے اُسے وہ درجے عطا فرمائے، جن کی بلندی کا تصور کرنا بھی ہمارے اور آپ کے بس کا کام نہیں ہے۔

جس طرح فصل کی بالیدگی اور پرورش کے لیے مناسب کھاد اور بارانِ رحمت کی ضرورت پڑتی ہے، اُسی طرح ایک مسلمان کے ایمان کی تازگی، اس کے عزم کے استحکام اور حوصلے کی بلندی کے لیے اسلاف کے ابتلا و آزمائش کے واقعات کا بار بار اعادہ از حد ضروری ہے۔ ورنہ ــــ ممکن ہے کہ وہ اضمحلال اور پستی کا شکار ہو جائے۔ اسی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے چند واقعات کو ایک خاص ڈھنگ سے مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔

خدا کرے، میری یہ کوشش میرے ہم سفر رفقا کے لیے مہمیز کا کام دے اور وہ اس مشعل کی روشنی میں تیزی کے ساتھ منزل کی طرف گامزن ہو جائیں۔ آمین ثم آمین

عرفان خلیلی

۱۳۹۴/۳/۲۳ھ

۱۹۷۴/۴/۱۷ء

کیا مسافر تھے؟

عرب کا ریگستان حدنظر تک پھیلا ہوا ہے۔ دوپہر کا وقت ہے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہے۔ بادِ صرصر کے تند خو جھونکوں اور ریت کے اڑتے ہوئے بگولوں نے منظر کو اور زیادہ بھیانک بنا دیا ہے۔ عام گزرگاہ ہونے کے باوجود دور دور تک کوئی مسافر نظر نہیں آتا۔ ہوا کے تیز جھکڑوں سے پیدا ہونے والی ڈراؤنی آوازیں کبھی کبھی فضا میں ارتعاش سا پیدا کر دیتی ہیں اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ جیسے بھٹکے ہوئے مسافروں کی روحیں آپس میں بین کر رہی ہوں یا ادھر ادھر کھڑے ہوئے اِکّا دُکّا ببول کے درخت ایک دوسرے کی عزلت پسندی اور بے تعلقی کا رونا رو رہے ہوں ـــــ دوسری طرف سورج کی تیز آتشیں کرنیں پورے ریگ زار کو آگ کے سمندر میں تبدیل کر دینے کے لیے بے تاب ہیں۔

وہ دیکھیے سامنے نخلستان میں تاریخ درختوں کے سائے میں لیٹی سو رہی ہے۔ اس کے دائیں بائیں حالات اور واقعات بیٹھے مورچھل جھل رہے ہیں۔

تاریخ کروٹ بدلتی ہے اور دونوں کے ہاتھ مورچھل جھلتے جھلتے رُک جاتے ہیں۔ ''یہ ہر طرف روشنی کیسی پھیلی ہوئی ہے؟'' تاریخ آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھتی ہے اور حیرت کے ساتھ سوال کرتی ہے۔

''چالیس سال سے کچھ زیادہ ہی مدت گزری ہوگی۔'' حالات جواب دیتے ہیں ''کہ ایک دن خود بخود چاروں طرف نور سا پھیل گیا۔''

''اچھا ـــــ پھر کیا ہوا ـــــ؟'' تاریخ حیرت زدہ ہو کر پھر سوال کرتی ہے۔

''معلوم یہ ہوا کہ شیخِ حرم کے یہاں فرزند تولد ہوا ہے، جس کی ولادت کے ساتھ ہی سارے عرب میں ایک نور سا پھیل گیا۔'' واقعات بات پوری کر دیتے ہیں۔

''تو کیا مجھے سوتے ہوئے نصف صدی گزر گئی؟'' تاریخ دونوں ہتھیلیوں سے آنکھیں ملتے ہوئے کہتی ہے۔

''جی ہاں ـــــ!'' حالات جواب دیتے ہیں۔

''اصحابِ فیل کے واقعے کے بعد آپ جو سوئی ہیں تو اب آنکھ کھولی ہے۔'' واقعات وضاحت کر دیتے ہیں۔

''ہوں ـــــ سچ کہتے ہو۔'' تاریخ 'ہوں' پر زور دیتے ہوئے جواب دیتی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اُسے کچھ گزرے ہوئے واقعات یاد آ رہے ہوں۔

''اور ـــــ ہاں چند روز قبل ادھر سے گزرتے ہوئے ایک قافلے والے آپس میں باتیں کر رہے تھے ـــــ'' حالات مزید وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ تاریخ بول اُٹھتی ہے:

''کیا باتیں کر رہے تھے؟'' تاریخ اتنی بے چینی سے سوال کرتی ہے جیسے کہ وہ سارے حالات ایک ہی بار میں معلوم کر لینا چاہتی ہو۔

''شیخِ حرم کے اسی یتیم پوتے نے نبی ہونے کا دعویٰ بھی کیا ہے۔'' حالات بات پوری کر دیتے ہیں۔

''یہ بات صحیح ہو سکتی ہے ـــــ کیوں کہ سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ابھی باقی ہے۔'' تاریخ غور و فکر میں ڈوبے ہوئے لہجے میں جواب دیتی ہے۔

اُس کے چہرے پر اشتیاق اور تجسس کے جذبات نمایاں ہیں۔ وہ خیالات میں ڈوبی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اس کے قدم غیر ارادی طور پر وادی غیر ذی زرع کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے دونوں رفیقوں کے ساتھ مکے میں داخل ہو جاتی ہے۔

شام کا وقت ہے۔ دن بھر کا تھکا ہوا سورج آرام کرنے کے لیے اپنے حجلۂ استراحت میں داخل ہونا چاہتا ہے ـــــ لیکن ـــــ اس کی نظریں اس اجتماع کی طرف لگی ہوئی ہیں، جو عتبہ، ابوسفیان،

ابوجہل ،نضر ،ولید، ابوالبختری ،امیہ اورانھیں جیسے دوسرے زعمائے عرب پر مشتمل ہے اوراس کے کان اُس تاریخی فیصلے کو سننے کے لیے بے تاب ہیں، جو بیت اللہ کے زیرِ سایہ ہونے والا ہے۔

''وہ دیکھیے ! شیخ حرم کا نبیرہ سامنے سے آ رہا ہے۔'' حالات آبادی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''اور دیکھیے ! سرداروں کا ایک ایلچی بھی اس کے ساتھ ساتھ ہے۔'' واقعات بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

''ذرا غور سے دیکھو____!'' تاریخ اپنے رفیقوں کو توجہ دلاتی ہے۔ ''کتنی باوقار ہے اس کی چال اور کتنا پرنور ہے اس کا چہرہ۔''

''یہ معصومیت اور چہرے سے پھوٹتی ہوئی نور کی شعاعیں صاف بتا رہی ہیں کہ یہ چہرہ کسی معمولی انسان کا نہیں ہوسکتا۔'' حالات والہانہ انداز میں تبصرہ کرتے ہیں۔

''تعجب ہے____! یہ عرب کے دماغ اس حقیقت کو نہیں سمجھ پاتے۔'' واقعات حیرت زدہ ہوکر کہتے ہیں۔

''ایسا نہیں ہے کہ وہ سمجھ نہ سکے ہوں۔'' تاریخ وضاحت کرتی ہے۔ ''حقیقت تو یہ ہے کہ یہ دانشورانِ عرب اِس حقیقت کو پا گئے ہیں اسی لیے تو بوکھلائے ہوئے ہیں اور سودا بازی کرنا چاہتے ہیں۔''

قریش کا یہ بطلِ جلیل خانہ کعبہ کے پاس آکر ٹھہر جاتا ہے۔ سردارانِ عرب اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ بے تکلفانہ انداز میں بے خوفی کے ساتھ اُن کے درمیان بیٹھ جاتا ہے۔ اشارہ پاکر عتبہ بن ربیعہ اس سے مخاطب ہوتا ہے۔

''اے برادرزادے! تمھاری عزت اور تمھارا مرتبہ ہمارے درمیان جو کچھ ہے اسے تم خوب جانتے ہو۔ خاندان بھر میں تمھارا مقام بلند ہے اور نسب کے لحاظ سے بھی تم ایک خاص اہمیت کے حامل ہو۔''

اللہ کے رسول ﷺ خاموشی سے سر جھکائے ہوئے سن رہے ہیں۔

''لیکن تم نے جو رویہ اختیار کیا ہے وہ ہم سب کے لیے نا قابلِ برداشت ہے۔'' عتبہ سرداروں کی طرف اشارہ کر کے مرعوب کن انداز میں کہنا شروع کرتا ہے۔ ''اب میری بات سنو! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس پر غور کرو۔ شاید ان میں سے کوئی بات تم قبول کر لو۔''

''اے ابو الولید! تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہو۔ میں ضرور سنوں گا۔'' اللہ کے پیغمبر ﷺ نہایت متانت اور سنجیدگی سے جواب دیتے ہیں۔

''اچھا سنو! عتبہ پھر بات شروع کرتا ہے۔ ''اگر اس سارے ہنگامے سے تمھارا مقصد دولت اکٹھا کرنا ہے تو ہم سے کہو! ہم تمھارے لیے اتنا مال جمع کر دیں گے کہ تم ہم سب سے بڑھ کر مالدار ہو جاؤ گے۔''

''اگر تم سرداری یا قیادت چاہتے ہو تو ہم سب سردارانِ عرب تمھیں آج ہی اپنا سردار تسلیم کیے لیتے ہیں اور تمھاری اطاعت و فرماں برداری کا حلف اٹھانے لیے آمادہ ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ سکوت کے ساتھ عتبہ کی تجاویز سنتے ہیں۔ اُس نے پھر کہنا شروع کیا۔

''اگر تمھیں حسن و جمال کی خواہش ہے تو خوب صورت سے خوب صورت عورت جس کو تم پسند کرو، ہم تمھاری زوجیت میں دینے کے لیے تیار ہیں۔''

عتبہ سانس لینے کے لیے رُکتا ہے اور پھر بات شروع کر دیتا ہے۔

''اور اگر یہ اس وجہ سے ہے کہ تم پر کسی جن کا سایہ ہو گیا ہے تو ہم اس کے لیے بھی تیار ہیں کہ بہترین سے بہترین علاج کا سامان مہیا کر دیں۔''

بات پوری کر کے عتبہ خاموش ہو جاتا ہے۔ اب حضور ﷺ کی باری تھی۔ آپ ؐ بہت ہی پروقار اور متانت بھرے انداز میں سرِ مبارک اُٹھاتے ہیں اور عتبہ سے سوال فرماتے ہیں:

''ابو ولید! کیا تم اپنی بات پوری کر چکے؟''

''ہاں ـــــ!'' عتبہ جواب دیتا ہے۔

''اب میری سنو!'' درد اور شفقت بھری آواز کعبے کی دیواروں سے ٹکراتی ہے۔

تمام سردارانِ عرب ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں۔

''یہ سب تمھاری خام خیالیاں ہیں۔'' وہی رعب دار آواز آہستہ آہستہ بلند ہوتی ہے:

''مجھے تو تمھارے لیے خدا نے اپنا پیغامبر بنا کر بھیجا ہے۔ اس نے مجھ پر اپنی کتاب اُتاری ہے۔ میں تم سے کچھ لینے نہیں آیا ہوں بلکہ دینے آیا ہوں۔ مجھے خدا نے حکم دیا ہے کہ تمھارے لیے بشیر و نذیر بنوں۔ میں نے اس کی ہدایات تم تک پہنچا دیں ____ اور ____ تمھاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا ہے۔''

سردارانِ عرب پر ایک سکتہ سا طاری ہو جاتا ہے اور وہ آنکھیں پھاڑے ہوئے رسول اللہ ﷺ کو تک رہے ہیں۔

''اگر اسے قبول کر لو تو یہ ____ تمھارے سب کے لیے ____ دنیا و آخرت کی بھلائی کا ذریعہ ہے۔'' اللہ کے رسول ﷺ نے ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرماتے ہوئے بات ختم کر دی۔

''اور اگر ہم اسے نہ مانیں ____ تو ____؟'' سرداروں میں سے ایک بول اٹھتا ہے۔

''تو میں اللہ کے حکم کا انتظار کروں گا۔'' لہجے میں پہاڑ جیسا استقلال پایا جاتا ہے۔

''یہاں تک کہ خدا میرے اور تمھارے درمیان فیصلہ صادر فرما دے۔''

بات پوری کر کے حضور ﷺ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک طرف کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ ہر طرف سناٹا سا چھا جاتا ہے اور سردارانِ عرب خاموش بیٹھے کے بیٹھے رہ جاتے ہیں۔

''کیسے اندھے اور بہرے ہیں یہ لوگ ____!'' تاریخ سردارانِ عرب کو گھورتی ہوئی آبادی کی طرف چل دیتی ہے۔ دور سے گنگنانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

نہ مال و زر کی، نہ سیم و گہر کی بات کرو
ہمارے ساتھ خلوصِ نظر کی بات کرو

سنہ ۴ نبوی

تپتی ہوئی دوپہر کا وقت ہے۔ سورج اپنے پورے قہر و جلال کے ساتھ فضا میں شعلے برسا رہا ہے۔ ریگزارِ مکہ آتش کدہ بنا ہوا ہے۔ ریت کے ذرّے چنگاریوں کی طرح دہک رہے ہیں۔ انسان تو انسان پرندے بھی اپنے اپنے گھونسلوں میں جان چھپائے دُبکے بیٹھے ہیں۔ لیکن مکہ کی آبادی کی طرف سے لڑکوں کے شور و غل اور قہقہوں کی آوازیں آرہی ہیں۔

''اس وقت بھی مکے والے اپنے گھروں میں نہیں بیٹھتے!'' تاریخ حیرت کے انداز میں کہتی ہے۔

''ضرور کوئی غیر معمولی بات ہے۔'' حالات جواب دیتے ہیں۔

''آیئے چل کر دیکھیں۔'' واقعات عرض کرتے ہیں۔

تینوں آبادی کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔

''ارے انسان کے ساتھ جانوروں جیسا برتاؤ۔'' چلتے چلتے حالات کے قدم رُک جاتے ہیں۔

''اس کے گلے میں رسّی بندھی ہوئی ہے ــــ لڑکے اُسے کھینچ رہے ہیں۔'' واقعات کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔

''اور وہ نیم مردہ حالت میں ــــ تپتی ہوئی ریت پر گھسٹ رہا ہے ــــ'' حالات کی بھرّائی ہوئی آواز ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔

''غریب گھسٹتا نہ پھرے تو کیا لاتیں اور گھونسے کھائے۔'' درد بھرے انداز میں تاریخ بات پوری کر دیتی ہے۔

''اس کے جسم سے خون رِس رہا ہے۔'' حالات تعجب کا اظہار کرتے ہیں۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ ظالموں نے اُسے پتھروں سے بھی مارا ہے۔''

''کمزور ـــــ دُبلا پتلا، جسم برہنہ، قد لمبا، رنگ مشکی، ہونٹ موٹے، بال گھونگھریالے۔'' واقعات اس پر تبصرہ کرتے ہیں۔ ''یہ مکے کا رہنے والا معلوم نہیں ہوتا۔''

''تم نے انھیں نہیں پہنچانا ـــــ؟'' رنج و غم میں ڈوبی ہوئی تاریخ کی آواز پھر سنائی دیتی ہے۔ ''یہ وہی حبشی غلام بلال بن رباحؓ ہیں، جو اللہ کے نبی ﷺ پر ایمان لانے کا اعلان کر چکے ہیں۔''

حالات اور واقعات سکتے کے عالم میں کھڑے ہیں۔ ان کی نگاہیں حضرت بلالؓ پر جمی ہوئی ہیں۔ اتنے میں ایک گرجدار آواز انھیں چونکا دیتی ہے۔

''اس ضدی کو ریت پر لٹا دو۔'' یہ امیہ بن خلف کی آواز ہے۔

لڑکے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جانوروں کی طرح گھسیٹتے ہوئے لے جاتے ہیں اور انگاروں کی طرح تپتی ہوئی ریت پر سیدھا لٹا دیتے ہیں۔

''وہ پتھر اٹھا لاؤ۔'' امیہ سب سے زیادہ وزنی پتھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لڑکوں سے مخاطب ہوتا ہے۔

تین چار لڑکے اس پتھر کو بڑی مشکل سے اُٹھا کر لاتے ہیں۔

''اِس کے سینے پر رکھ دو تا کہ حرکت بھی نہ کر سکے۔'' اُمیہ کی کرخت آواز پھر سنائی دیتی ہے۔ ''اور اپنے آبائی دین سے انحراف کا مزہ چکھ لے۔''

وہ وزنی پتھر جو چار لڑکوں سے بھی مشکل سے اٹھا تھا، حضرت بلالؓ کے سوکھے ہوئے سینے پر رکھ دیا جاتا ہے۔ پسلیاں چرچرا اٹھتی ہیں۔ ریت کے تپتے ہوئے ذرّے نیچے سے چرکے لگا رہے ہیں اور اوپر سے گرم پتھر کھال کے نیچے کی چربی تک کو پگھلا رہا ہے۔ حضرت بلالؓ کباب

سیخ بنے ہوئے ہیں ــــ اور ــــ پہلو بدلنے کا بھی یارا نہیں۔ چاروں طرف کھڑے ہوئے لڑکے قہقہے لگا رہے ہیں۔ لیکن ــــ اس مجاہدِ جاں باز کے ہونٹوں پر اُف تک نہیں ہے۔ سارا جسم پھک رہا ہے ــــ لیکن ٹس سے مس نہیں ہو سکتے۔ نگاہ پر چوں کہ کوئی پابندی نہیں ہے، اس لیے وہ کبھی بیت اللہ اور کبھی دارارقم کی طرف اُٹھ جاتی ہے اور جب واپس لوٹتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ساتھ ایک روحانی سکون اور قلبی ٹھنڈک لے کر آئی ہو اور یہ غریب ــــ اس سے پورا پورا سکون حاصل کرنے کے لیے ذرا دیر کے واسطے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

''بلال! اب بھی مان جا ــــ محمدؐ کے خدا سے باز آ ــــ تیرے خدا لات و عزیٰ ہیں۔'' پھر وہی گرجدار آواز گونجتی ہے۔

سننے والوں نے سنا کہ اس گرجدار آواز کے جواب میں ایک نحیف اور درد بھری آواز بلند ہوتی ہے، جسے سن کر روحِ کائنات جھوم اٹھتی ہے اور باطل کا کلیجہ کانپ اٹھتا ہے۔

''اَحَــدٌ اَحَــدٌ''

شیطان کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگتا ہے اور وہ دانت پیستے ہوئے چیخ اٹھتا ہے۔''اس پر کوڑے برساؤ ــــ اس کی زبان بند کر دو۔''

ایک دفعہ پھر لڑکے کوڑوں، گھونسوں اور لاتوں سے حضرت بلالؓ کی مدارات شروع کر دیتے ہیں۔

تاریخ اس انسانیت سوز بربریت کے کھیل کو زیادہ نہ دیکھ سکی۔ وہ اپنا منہ پھیر لیتی ہے اور آنسو خشک کرتی ہوئی ایک طرف کو روانہ ہو جاتی ہے۔ فضا میں ایک آواز اُبھرتی ہے جو ارتعاش پیدا کر دیتی ہے ؎

حق بات پہ تعزیریں کچھ آج نہیں کوثرؔ
بے درد زمانے کی یہ ریت پرانی ہے

☆☆

سنہ ۱۰ نبوی

''ارے ــــ! یہ کیسے انسان ہیں!'' شعب ابو طالب کے پاس سے گزرتے ہوئے واقعات نے حیرت کے ساتھ کہا۔

''پتیاں کھا رہے ہیں ــــ درختوں کی چھال چبا رہے ہیں۔'' حالات نے حیرت میں اور اضافہ کر دیا۔

''تم نہیں جانتے ــــ؟'' تاریخ کے قدم چلتے چلتے رُک جاتے ہیں۔ ''یہ خاندان بنی ہاشم کے افراد ہیں۔''

''یہاں اس حال میں کیوں ہیں ــــ؟'' حالات نے پھر سوال کیا۔

''آج سے پورے تین سال قبل مکہ کے قبائل نے متحد ہو کر ابو طالب کے سامنے دو شرطیں رکھی تھیں۔'' تاریخ واقعات پر روشنی ڈالنے لگتی ہے۔ ''پہلی شرط یہ تھی کہ وہ اپنے بھتیجے محمد (ﷺ) کو ان کے حوالے کر دیں تا کہ وہ ان کا قصہ پاک کر دیں۔''

''دوسری شرط کیا تھی ــــ؟'' حالات جیسے اس پہلی شرط کو نظر انداز کر دینا چاہتے ہوں۔

''دوسری شرط یہ تھی کہ پورے خاندان بنی ہاشم کا معاشرتی بائیکاٹ کر دیا جائے۔'' تاریخ پھر واقعات دہرانا شروع کر دیتی ہے۔ ''جس کی رو سے دوسروں سے ملنے جلنے، شادی بیاہ، خرید و فروخت، حتیٰ کہ ان کو کھانے پینے کا سامان پہنچانے پر بھی پابندی ہو گی۔''

''پھر کیا ہوا ــــ؟'' واقعات بہت بے چین نظر آ رہے ہیں۔

''ابو طالب نے بھتیجے کی خاطر دوسری شرط منظور کر لی اور اپنے پورے خاندان کو لے

کر، جس میں مسلم اور غیر مسلم سب شامل ہیں، اس وادی میں چلے آئے۔" تاریخ بات پوری کر دیتی ہے۔

"تین سال سے یہ پورا خاندان سب سے الگ تھلگ اس وادی میں مقید ہے!" حالات مزید استفسار کرتے ہیں۔

"صرف ابولہب نے اپنے خاندان کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ کفارِ مکہ کے ساتھ ہے۔" تاریخ نے وضاحت کی۔

"یہ تین سال انھوں نے کیسے گزارے؟" واقعات نے پھر سوال کیا۔

"یہ نہ پوچھو ــــ!" تاریخ کی آواز بھرانے لگتی ہے۔ وہ رنج وغم کے جذبات سے مغلوب نظر آ رہی ہے۔ "یہ حق کی طاقت ہی ہے، جو انھیں زندہ رکھے ہوئے ہے ورنہ ــــ"

"ورنہ کیا ہوتا ــــ؟" حالات تشویشناک انداز میں بات کاٹ دیتے ہیں۔

"ورنہ ــــ یہ کبھی کے پیوندِ زمین ہو چکے ہوتے۔" تاریخ بات پوری کر دیتی ہے۔

"پھر بھی ــــ آخر یہ گزر کیسے کر رہے ہیں؟" حالات کی حیرت بڑھتی جاتی ہے۔

"گزر بسر ــــ؟ کبھی کوئی مسلمان رات کی تاریکی میں کچھ دے جاتا ہے۔ کبھی کسی غیر مسلم کے دل میں رحم آ جاتا ہے تو وہ بھی چھپ چھپا کر کچھ پہنچا دیتا ہے۔" تاریخ کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگتے ہیں۔ اور جب کچھ بھی نہیں ہوتا تو یہ غریب فاقوں کا سہارا لیتے ہیں یا پھر درختوں کی چھال یا پتیاں چباتے ہیں۔"

"اس وادی میں تو اتنے درخت بھی نہیں ہیں، جن کی چھال اور پتیوں پر یہ گزارا کر سکیں۔" حالات نے ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"وہ دیکھو ــــ ایک شخص سوکھے چمڑے کو بھگو رہا ہے۔" واقعات ایک طرف اشارہ کرتے ہیں۔

"اسی کو اُبال کر کھائیں گے۔" تاریخ نے درد بھرے انداز میں کہا۔

"نہ کھائیں تو کیا کریں بے چارے۔" حالات نے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔

''سنو ___ سنو ___ معصوم بچے کس بری طرح بلک رہے ہیں۔'' تاریخ بچوں کی آواز کی طرف دونوں کوتوجہ دلاتی ہے۔

''مائیں دودھ پلا کراُنھیں چپ کیوں نہیں کرتیں؟'' واقعات نے سوال کیا۔

''دودھ ___!'' تاریخ پھر خیالات میں ڈوب جاتی ہے۔''دودھ کہاں سے آئے۔ چھاتیاں سوکھ چکی ہیں۔''

''اے اللہ ___! ان معصوموں پر رحم فرما۔'' واقعات کے دونوں ہاتھ غیر ارادی طور پر آسمان کی طرف اُٹھ جاتے ہیں۔

''ارے ___ یہ اونٹ پر کون آرہا ہے؟'' حالات نے سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تو ہشام بن عمرو ہے۔'' واقعات آنے والے کو حیرت سے دیکھتے ہوئے جواب دیتے ہیں۔''خدا خیر کرے۔''

''لیکن چہرہ تو نیک ارادے کا اظہار کر رہا ہے۔'' تاریخ نے ہشام کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہشام کا اونٹ گھاٹی کے قریب پہنچ جاتا ہے۔معصوموں کے بلک بلک کر رونے کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے۔ ہشام وہیں اونٹ روک دیتا ہے۔اس کے چہرے کا رنگ آہستہ آہستہ بدلنے لگتا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ دل میں ایک بے چینی اور چبھن سی محسوس کر رہا ہواور بچوں کی رندھی ہوئی آوازیں اس کے ضمیر کو جھنجھوڑ رہی ہوں۔وہ خوب سمجھتا ہے کہ یہ معصوم بچے کیوں بلک رہے ہیں۔اس کی وارفتگی اس بات کی غمازی کر رہی ہے کہ جیسے اس کی سوئی ہوئی انسانیت بیدار ہو رہی ہو۔وہ اپنے اونٹ کا رُخ مکہ کی آبادی کی طرف پھیر دیتا ہے۔

سب سے پہلے وہ زُہیر ابن ابی امیہ کے مکان پر پہنچتا ہے،جس کی ماں عبدالمطلب کی بیٹی ہے اور یہ کہہ کر اس کو غیرت دلاتا ہے:

''بڑی شرم کی بات ہے کہ تم اطمینان سے کھاؤ پیو اور چین کرو مگر تمھاری ماں کے بھائی

بندوں کا یہ حال ہو کہ وہ فاقوں پر فاقے کر رہے ہوں۔ اُس کی آواز فرطِ غم سے بھرّانے لگتی ہے۔ پیڑوں کی پتیاں اور سوکھے چمڑے چبا رہے ہوں۔ اُن کے معصوم بچے دودھ کے لیے مچھلی کی طرح تڑپ رہے ہوں۔"

"میں تنہا کیا کر سکتا ہوں۔" زبیر نے اس طرح بے تابانہ سوال کیا، جیسے کہ اس کے دل کی بات کہہ دی گئی ہو۔

"تم تیار ہو جاؤ زُہیر ـــــ!" ہشام اس کی ہمت بڑھاتے ہوئے جواب دیتا ہے۔ "تو ہم دونوں اپنے ہم خیال پیدا کر کے کل ہی سے اس بائیکاٹ کی سخت مخالفت شروع کر سکتے ہیں۔"

دونوں رات ہی رات مطعم ابن عدی، ابوالبختری اور زمعہ ابن اسود کو اپنا ہم خیال بنا لیتے ہیں۔ اگلے دن صبح کو یہ لوگ خانۂ کعبہ کے قریب قریش کی مجلس میں آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ تاریخ ایک طرف کھڑی بدلتے ہوئے حالات کا بہ غور مطالعہ کر رہی ہے۔ ہشام کعبہ کے طواف سے فارغ ہو کر سردارانِ قریش سے مخاطب ہوتا ہے۔

"اے قریشیو! کیا یہ مناسب ہے کہ ہم اطمینان سے کھاتے پیتے رہیں اور ہمارے ہاشمی بھائی فاقوں پر فاقے کرتے رہیں۔ ان کے شیر خوار بچے دودھ کے لیے بلکتے رہیں۔ نہ انھیں کچھ خریدنے کی اجازت ہو نہ بیچنے کی۔ یہ سیاست نہیں درندگی ہے۔"

"آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" ابوجہل سوال کرتا ہے۔

"خدا کی قسم میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک کہ اس بائیکاٹ کے عہدنامے کو پارہ پارہ نہ کر دوں۔" ہشام بلند آواز میں جواب دیتا ہے۔

"تم جھوٹے ہو۔" ابوجہل غرّا اٹھتا ہے۔ "خدا کی قسم! تم اس کو ہاتھ تک نہیں لگا سکتے۔"

اسی وقت زُہیر، ابوالبختری اور زمعہ بھی ہشام کی تائید کرنے لگتے ہیں۔ حالات کا رُخ بدل جاتا ہے اور ادھر سامنے سے ابو طالب چند ہاشمیوں کے ساتھ آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سب کی نظریں اُن کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔ ہر شخص کوئی اہم بات سننے کے لیے بے تاب نظر آ رہا ہے۔

''شیخِ حرم! خیر تو ہے۔ آپ کیسے تشریف لائے۔'' ہشام آگے بڑھ کر ابو طالب کا خیر مقدم کرتا ہے۔

''لوگو___! تم جانتے ہو، میرا بھتیجا کبھی جھوٹ نہیں بولتا، جو بات کہتا ہے وہ سچ ہوتی ہے۔'' ابو طالب قریب آ کر حاضرین کو مخاطب کرتے ہیں۔

''بے شک وہ صادق ہیں۔'' کئی زبانوں سے ایک ساتھ یہ جملہ نکلتا ہے۔

''اس نے آج یہ خبر دی ہے کہ تمھارا عہد ختم ہو چکا ہے۔ اُسے دیمک نے چاٹ لیا ہے۔'' ابو طالب نے فرمایا۔

''اگر ایسا نہ ہوا تو___؟'' ابو جہل سوال کرتا ہے۔

''میں اپنے بھتیجے کو تمھارے حوالے کر دوں گا۔ پھر جیسا جی چاہے اس کے ساتھ سلوک کرنا لیکن___''

''لیکن کیا___؟'' ابو جہل بات کاٹ کر سوال کرتا ہے۔

''اگر یہ بات سچ نکلی کہ اللہ کے نام کے علاوہ باقی ساری عبارت دیمک نے چاٹ لی ہے تو بائیکاٹ آج سے ختم۔'' ابو طالب نے بات پوری کر دی۔

''ضرور___ضرور___'' ایک ساتھ کئی لوگوں نے ہم آواز ہو کر کہا۔

یہ شرط سن کر سردارانِ قریش بہت خوش ہوتے ہیں کیوں کہ آج ان کی دیرینہ آرزو پوری ہوتی نظر آ رہی ہے۔ ان کے خیال میں یہ بات ناممکن ہے کہ خدا کا نام تو محفوظ رہے باقی ساری عبارت دیمک چاٹ لے۔ تحریر لائی جاتی ہے۔ لیکن___ اُسے دیکھتے ہی تمام قریشیوں کے منہ لٹک جاتے ہیں۔ مخبرِ صادق ﷺ کی اطلاع حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوتی ہے۔ ابو طالب اور ان کے حمایتیوں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ یہ خبر بجلی کی طرح سارے مکہ میں پھیل جاتی ہے۔

بنی ہاشم اپنے اپنے گھروں کو واپس آ جاتے ہیں۔ مکہ کا اُجڑا ہوا محلّہ دوبارہ آباد ہو جاتا ہے۔ داعیانِ حق پھر اپنے فرض کی ادائی میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ مکہ کے در و دیوار زبانِ

حال سے کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں: جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا٥ (حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل نابود ہونے والا ہے)۔

تاریخ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک سمت کو روانہ ہو جاتی ہے۔

سنہ ۱۰ نبوی

یہ دردناک منظر دیکھ کر تاریخ بہت زیادہ مغموم نظر آ رہی ہے۔ اضمحلال کا یہ عالم ہے کہ قدم اُٹھانا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ گزرے ہوئے واقعات اس کی نظروں کے سامنے اب بھی پھر رہے ہیں، جن کے تاثر سے آنکھیں پھاڑے ہوئے وہ ایک ہی سمت مسلسل دیکھے جا رہی ہے اور اُسے بار بار جھرجھری سی آ جاتی ہے۔ ''مجھے سہارا دو۔'' اس نے نحیف آواز میں کہا۔

حالات اور واقعات دوڑ کر اُسے سنبھال لیتے ہیں۔ اس پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ دونوں رفیق اسے سہارا دے کر نزدیک کے نخلستان میں لے جاتے ہیں اور چشمے کے کنارے لٹا دِیتے ہیں اور خود اس کے قریب بیٹھ جاتے ہیں۔

گھنٹے دنوں میں اور دن مہینوں میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔ تاریخ آرام کرتی رہی۔ کئی ماہ کے بعد اس نے پھر آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی اضمحلال کے اثرات جھلک رہے ہیں۔ وہ بیمار سی نظر آ رہی ہے۔ اس لیے تبدیلِ آب و ہوا کی غرض سے وہ طائف کے پر فضا خطے کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔ طائف کے نزدیک پہنچ کر جب اُس کی نظریں لہلہاتے کھیتوں، سرسبز باغات، سایہ دار ٹھنڈے مقامات اور پانی کے متعدد چشموں پر پڑتی ہیں تو اس کے چہرے پر شگفتگی سی آ جاتی ہے۔ اس کے قدم تیز تیز اُٹھنے لگتے ہیں۔

وہ ابھی آبادی میں داخل بھی نہیں ہوئی ہے کہ ایک پتھر آ کر اس کے پیروں کے پاس گرتا ہے۔ وہ چونک کر ٹھٹک جاتی ہے۔ حالات بڑھ کر اس پتھر کو اُٹھا لیتے ہیں۔

''ارے ___! اس میں خون لگا ہوا ہے۔'' واقعات حالات کے ہاتھ سے پتھر لیتے

ہوئے تاریخ کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ تاریخ ابھی پتھر کو غور سے دیکھ ہی رہی ہے کہ قریب ہی سے شور و غل کی آواز آنے لگتی ہے، جیسے سیکڑوں آدمی کسی کو گالیاں دے رہے ہوں، برا بھلا کہہ رہے ہوں، مذاق اُڑا رہے ہوں، ساتھ ہی ''مارو۔۔۔مارو۔۔۔نکالو۔۔۔نکالو'' کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں اور پھر سامنے سے اوباشوں کا غول کا غول نمودار ہوتا ہے، جن میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں پتھر ہیں، جنھیں اس باوقار ہستی پر پھینکا جا رہا ہے، جو ان کے آگے لڑکھڑا لڑکھڑا کر چل رہی ہے۔

''ارے۔۔۔! اِن کے ساتھ۔۔۔ یہ سلوک۔۔۔!!'' تاریخ کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدم رُک جاتے ہیں۔ غنڈوں اور اوباشوں کا تشدد بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ لوگ تاک تاک کر رسول اللہ ﷺ کے ٹخنوں پر پتھر مار رہے ہیں اور تالیاں بجا رہے ہیں۔ خون بے تحاشہ بہہ رہا ہے۔ موزے خون میں لت پت ہو جاتے ہیں۔ حضور ﷺ جب نڈھال ہو کر بیٹھ جاتے ہیں تو یہ ظالم بازو پکڑ کر اُٹھا لیتے ہیں اور پھر ٹخنوں پر پتھر مارنا شروع کر دیتے ہیں۔ شہر پیچھے چھوٹ چکا ہے۔ غنڈوں کی تعداد بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ آخر کار جب آپؐ بالکل نڈھال ہو جاتے ہیں تو ایک باغ کی چہار دیواری سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ رفیقِ سفر اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے دل دوز آواز میں عرض کرتا ہے:

''آپؐ ان کے لیے خدا سے بددعا کر دیجیے۔''

''میں۔۔۔ان کے لیے بددعا کروں۔۔۔ایسا نہیں ہو سکتا۔'' نحیف و زار نگاہیں رفیقِ سفر کی طرف اُٹھ جاتی ہیں، جن میں اس وقت بھی شفقت و محبت کے جذبات موجزن نظر آتے ہیں۔

''یہ لوگ خدا پر ایمان نہ لائے نہ سہی۔۔۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کی نسلیں ضرور خدائے واحد کی پرستار ہوں گی۔''

جبریل علیہ السلام آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کے فرشتے کو بھیجا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر آپؐ حکم دیں تو طائف کے دونوں طرف کے پہاڑوں کو آپس میں ٹکرا دیا جائے۔ اہل طائف چور چور ہو جائیں۔ ان کے وجود کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔''

خدا کی مدد پشت پر ہے۔ آپؐ انتقام لے سکتے ہیں ــــ لیکن ــــ اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام سنتے ہی رسول اللہ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے ہیں۔ وہ آنکھیں، جو اتنی اذیتیں اور تکلیفیں اُٹھانے کے بعد بھی خشک رہی ہوں ــــ ظالموں سے بدلہ لینے کے تصور ہی سے نمناک ہو جاتی ہیں۔ عفوو درگزر کا یہ مجسمہ، اپنی ذات کے لیے انتقام کے نام ہی سے کانپ اٹھتا ہے ــــ آپؐ دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتے ہیں:

''اے رب العالمین ــــ! یہ نادان ہیں ــــ مجھے ابھی نہیں پہچانتے ــــ ان کو معاف فرما دے۔ میں ان سے نا امید نہیں ہوں۔ شاید ان کی نسل سے کوئی ایک بھی ایسا پیدا ہو جائے، جو تجھے اپنا رب مان لے اور سیدھی راہ پر چلنے لگے۔''

پیکرِ شفقت ﷺ کے یہ الفاظ سن کر تاریخ کے صبر و ضبط کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور محسنِ انسانیت ﷺ کے عفوو درگزر اور رحمت و شفقت کو دیکھ کر بے اختیار اس کی زبان پر آ جاتا ہے۔ ع

جو برسائیں پتھر، جو کانٹے بچھائیں، جو دن رات دکھ دیں، جو ہر دم ستائیں
اِنھیں دشمنانِ نبوت کے حق میں، زبانِ نبی پر دعا اللہ اللہ

آہستہ آہستہ پوری فضا گنگناہٹ سے بھر جاتی ہے، جیسے کہ جن اور فرشتے، شجر اور حجر سب کے سب اللہ کے آخری نبی ﷺ پر درود بھیج رہے ہوں اور آواز کی کپکپاہٹ اس بات کی غمازی کر رہی ہے کہ اہلِ طائف کی اس وحشت و بربریت کو دیکھ کر ان کے دل رنج و غم سے پھٹے جا رہے ہیں ع

سلام اس پر کہ گھر والے بھی جس سے جنگ کرتے ہیں
سلام اُس پر وطن والے بھی جس کو تنگ کرتے ہیں
سلام اُس پر جو سچائی کی خاطر دُکھ اُٹھاتا ہے
جو پتھر کھاتا جاتا ہے، دعائیں دیتا جاتا ہے

سنہ ۱ ہجری

''میں حاضر ہوں ـــــــ اے میرے مولا ـــــــ! میں حاضر ہوں۔''

''ارے ـــــــ!! ابولہب کے گھر سے ـــــــ یہ آواز ـــــــ!'' تاریخ حیرت زدہ ہوکر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوتی ہے۔

''چلیے ـــــــ اندر چل کر دیکھیں ـــــــ آخر ہے کون؟'' واقعات نے جواب دیا۔

ابولہب ـــــــ دشمنِ خدا ـــــــ کے گھر میں تینوں داخل ہوجاتے ہیں۔ یہ آواز اس کی چہیتی بیٹی دُرّہ بنت ابی لہب کی ہے، جو اندر کی کوٹھری میں مقید ہے۔ وہ دوزانو بیٹھی ہوئی ہے۔ دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہیں۔ آنکھیں بند ہیں۔

''میں حاضر ہوں اے میرے معبود! میں حاضر ہوں!'' وہ اپنے مالکِ حقیقی کے حضور گڑگڑا رہی ہے۔ ''اے میرے خدا! مجھے اس قید سے رہائی دلا کر اپنے پیارے حبیبؐ کے پاس یثرب پہنچا دے۔''

اتنے میں ابولہب اور اس کی بیوی امِ جمیل داخل ہوتے ہیں۔ قدموں کی چاپ سن کر دُرّہؓ آنکھیں کھول دیتی ہے۔

''بیٹی! اپنے ابو کا کہنا مان جا۔'' امِ جمیل پیار بھرے انداز میں دُرّہؓ سے مخاطب ہوتی ہے۔ ''اور محمدؐ کے خدا سے باز آ۔''

''امی! مجھے جانے دو۔ میرا رب مجھے بلا رہا ہے۔'' دُرّہؓ والہانہ انداز میں کہتی ہے۔

''ابھی تیرے سر سے محمدؐ کا جادو نہیں اُترا ہے؟'' ابولہب دانت پیستے ہوئے سوال کرتا ہے۔

''ابو جان! یہ وہ نشہ نہیں... جسے تُرشی اتار دے۔'' دُرّہؓ فیصلہ کن انداز میں جواب دیتی ہے۔

''بدتمیز لڑکی! خاموش رہ۔'' ابولہب غصے سے تلملا اٹھتا ہے۔ بڑھ کر دُرّہ کے داہنے گال پر ایک طمانچہ رسید کر دیتا ہے اور پھر اپنی بیوی سے مخاطب ہوتا ہے:

''ام جمیل! تمھاری وجہ سے مجبور ہوں ورنہ ــــ اس چھوکری کی زبان میں بند کر چکا ہوتا۔''

''دُرّہ! یہ تکلیفیں کب تک سہتی رہے گی۔'' ام جمیل کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

''اسی لیے تو کہتی ہوں امی! مجھے آزاد کر دو ــــ میں یثرب...''

جملہ پورا بھی نہیں ہونے پاتا ہے کہ ابولہب کی گرج دار آواز گونجتی ہے:

''بند کر اپنی زبان ــــ خبردار جو میرے سامنے یثرب کا نام لیا۔''

دُرّہؓ خاموش ہو جاتی ہے۔

''دیکھ بیٹی! تیری کلائیوں میں خون چھلک آیا ہے۔'' بندھے ہوئے ہاتھوں کو سہلاتے ہوئے اُم جمیل دُرّہؓ سے مخاطب ہوتی ہے:

''میرے جسم کا سارا خون بھی اگر اللہ کی راہ میں کام آئے تو میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی۔'' دُرّہؓ بے باکانہ جواب دیتی ہے۔

ابولہب کی آنکھیں شعلے برسانے لگتی ہیں۔ دُرّہؓ کا جواب سن کر وہ تلملا اٹھتا ہے۔

''کاش میں اسے پہلے ہی زندہ دفن کر چکا ہوتا۔''

''آپ اب بھی ایسا کر سکتے ہیں۔'' دُرّہؓ بہت ہی سنجیدگی سے جواب دیتی ہے۔

ابولہب پھر طمانچہ مارنے کے لیے بڑھتا ہے مگر ام جمیل درمیان میں آ جاتی ہے۔ وہ غصے میں بھرا کوٹھری سے باہر چلا جاتا ہے۔

''بیٹی! ضد چھوڑ دے۔ لات و ہبل اب بھی تجھے معاف کر دیں گے۔'' ام جمیل پیار بھرے انداز میں دُرّہؓ کو سمجھانے لگتی ہے۔

''مجھے ان کی خفگی کی کوئی پروا نہیں بشرطے کہ میرا خدا مجھ سے خوش ہو جائے۔ دُرّہؓ پورے اطمینان کے ساتھ جواب دیتی ہے۔

''ایسا نہ کہہ بیٹی۔۔۔'' اُمِ جمیل بڑھ کر دُرّہؓ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔''دیکھ تیرا آبائی مذہب تیرے لیے اپنی آغوش کھولے ہوئے ہے۔''

''امی۔۔۔! آپ مجھے روشنی سے پھر تاریکی کی طرف واپس لانا چاہتی ہیں۔'' دُرّہؓ بھی محبت بھرے انداز میں جواب دیتی ہے۔

''دیکھ دُرّہ۔۔۔! تیرے باپ کا غصہ بہت خراب ہے، کسی دن بات بڑھ نہ جائے۔'' ام جمیل نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''اگر میرا خدا مجھ سے راضی ہے تو مجھے کسی کی بھی ناراضگی کی پروا نہیں۔'' دُرّہؓ والہانہ انداز میں جواب دیتی ہے۔

''اگر تجھے کچھ ہو گیا۔ تو میں کیا کروں گی۔'' ام جمیل کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

''آپ میرے ساتھ ہو جائیں امی۔۔۔ تو کتنا اچھا ہو۔'' دُرّہ کی آنکھوں میں چمک سی آ جاتی ہے۔ ''ہم دونوں یثرب بھاگ چلیں گے۔''

''ایسا نہ کہہ۔۔۔ ہبل ناراض ہو جائے گا۔'' ام جمیل جلدی سے جواب دیتے ہوئے دُرّہؓ کے ہاتھوں کی رسّی کو ڈھیلا کرنے لگتی ہے۔

''دیکھ بیٹی۔۔۔! غور کر لے اور پھر اپنا فیصلہ بدل دے۔'' ام جمیل یہ کہتی ہوئی باہر چلی جاتی ہے۔

دو تین روز کے بعد دُرّہؓ کو موقع مل جاتا ہے اور وہ قید سے رہا ہو کر مدینے کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔

مدینہ منورہ پہنچ کر اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی لیکن جب اس نے سنا کہ مدینے کی کچھ عورتیں سرگوشیاں کر رہی ہیں:

''اِس کی ہجرت کو خدا کیا پسند کرے گا جب کہ اُس کا باپ اور اس کی ماں دونوں خدا اور

رسولؐ کے بدترین دشمن ہیں۔"

تو اس کا دل کانپ اٹھتا ہے۔ اُس کے ہوٹ تھر تھرانے لگتے ہیں۔

"کیا میرے والدین کا طرزِ عمل میری نجات میں رکاوٹ بن سکتا ہے؟"

ایثار و قربانی کے جذبات سے چھلکتا ہوا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ معبودِ حقیقی کی خوشنودی کی روحانی بھوک اسے بے تاب کر دیتی ہے، جس دل نے والدین کی جدائی کا اثر بالکل قبول نہیں کیا تھا وہ اللہ کی ناراضگی کے خیال ہی سے بے چین ہو جاتا ہے۔ دُرّہؓ کے قدم آستانۂ رسالت کی طرف جلد جلد بڑھنے لگتے ہیں۔ رسولِ اکرم ﷺ کے حضور میں پہنچ کر وہ سارا ماجرا کہہ سناتی ہے۔

"اے خدا کے سچے رسولؐ ــــ!" دُرّہؓ کی آواز تھرتھرانے لگتی ہے۔ "مجھے اس کا غم نہیں کہ دنیا میری قربانی کو کسی قابل سمجھتی ہے یا نہیں ــــ ہاں، یہ اندیشہ مجھے بے چین کیے ہوئے ہے کہ کیا میرا خدا بھی میری اس ہجرت کو ٹھکرا دے گا۔

دُرّہؓ کی روداد سن کر خدا کے رسول ﷺ آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔

"اے لوگو ــــ!" آپؐ بے اختیارانہ حاضرین کو مخاطب کرتے ہیں۔ "دُرّہؓ کے ایثار کا صلہ اس کے لیے ہے اور اس کے والدین کے گناہوں کی پاداش خود اُن کے لیے ہے۔"

طنز کرنے والی زبانیں خاموش ہو جاتی ہیں۔ دُرّہؓ کا دل مطمئن ہو جاتا ہے اور اس کے چہرے پر بشاشت دوڑ جاتی ہے۔

تاریخ اپنے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ آگے بڑھنے لگتی ہے۔ فضا گنگناہٹ سے معمور ہو جاتی ہے۔ ع

ہم کو تو ایک تجھ سے دو عالم میں ہے غرض
سب بدگماں ہوا کریں، تو بدگماں نہ ہو

۱؎ یہ انصاریہ بنی دینار سے تھیں۔ بعض روایتوں میں ان کا نام عاصمہ اور بعض میں ہند ملتا ہے۔

سنہ ۳ ہجری

دشمنوں کی اُڑائی ہوئی یہ افواہ کہ توبہ توبہ رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے، آناً فاناً مدینہ منورہ میں پھیل جاتی ہے۔ مسلمانوں کے گھروں میں کہرام مچ جاتا ہے۔ لوگ حسرت و یاس کی تصویر بنے ایک دوسرے کا منہ تک رہے ہیں۔ پوری فضا غم و اندوہ میں ڈوبی ہوئی ہے۔

''کیا یہ بات صحیح ہے کہ اللہ کے آخری نبیؐ شہید ہو چکے ہیں؟'' حالات تاریخ سے سوال کرتے ہیں۔

''مجھے تو یہ صرف پروپیگنڈہ معلوم ہوتا ہے۔'' تاریخ بہت ہی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیتی ہے۔

''تو پھر کیوں نہ اُحد تک چل کر حقیقتِ حال معلوم کر لی جائے۔'' واقعات نے ایک تجویز پیش کی۔

''مناسب ہے۔'' تاریخ واقعات کی طرف رُخ کر کے جواب دیتی ہے اور پھر تیز قدموں کے ساتھ اُحد کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔ دونوں رفیق بھی اس کے ہمراہ ہو جاتے ہیں۔

راستے میں ایک صحابیہ امِّ ایمنؓ ملتی ہیں، جو اس وحشت ناک خبر کو سن کر تڑپ اٹھی تھیں۔ اُن کا چہرہ اندرونی بے چینی اور دلی اضطراب کی عکاسی کر رہا ہے۔ یہ دیوانہ وار پورے جوش کے ساتھ تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی رسول اللہ ﷺ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے اُحد کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اُس طرف سے آتے ہوئے ایک شخص نے آپؓ کو پہچان کر ہمدردانہ لہجے میں کہا:

''اے اُم ایمن۔۔۔۔! تمھارے والد جنگ میں شہید ہو گئے۔''

''یہ بتاؤ۔۔۔۔ رسول اللہؐ کو تم نے کس حال میں چھوڑا ہے؟'' ام ایمن نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ اور پھر۔۔۔۔ جواب کا انتظار کیے بغیر آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک اور شخص آتا ہوا ملتا ہے۔ وہ بھی از راہِ ہمدردی یہ اطلاع دیتا ہے: تمھارے شوہر مارڈالے گئے۔''

ام ایمنؓ اپنے خیالات میں اتنی کھوئی ہوئی ہیں کہ اس کی بات کی طرف توجہ تک نہیں دیتیں اور پھر وہی سوال کرتی ہوئی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ جاتی ہیں۔

''رسول اللہؐ کیسے ہیں؟''

میدانِ کارزار نزدیک آجاتا ہے۔ لوگ ام ایمنؓ کو پہچان کر ان کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ ایک شخص درد بھرے لہجے میں کہتا ہے:

''اے ام ایمنؓ! تمھارا بھائی سینے پر برچھی کھا کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔''

ام ایمنؓ کی نظریں اِدھر اُدھر کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔

''خدا کے بندو۔۔۔۔! یہ تو بتاؤ، رسول اللہ ﷺ کہاں ہیں؟'' اِم ایمن کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے ہیں۔ ''میرے کانوں نے بڑی منحوس خبر سنی ہے۔۔۔۔ میرے منہ میں خاک۔۔۔۔ زبان سے وہ بات نہیں نکلتی۔۔۔۔ جو میں نے سنی ہے۔'' انھوں نے رُک رُک کر دریافت کیا۔

''رسول اللہؐ زندہ ہیں۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔'' کہنے والے کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ ام ایمنؓ جھٹ سے بول اٹھیں:

''جب سرکار زندہ ہیں تو مجھے کوئی غم نہیں۔۔۔۔ کسی عزیز کے مرنے سے بھی میں غمگین نہیں ہوسکتی۔ رسولِ اللہؐ کے ہوتے ہوئے ساری مصیبتیں ہیچ ہیں۔'' ع

میں بھی اور باپ بھی، شوہر بھی، برادر بھی فدا
اے شہِ دیں ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

تاریخ حیرت سے ام ایمن رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا منہ تک رہی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ

سے ان کی یہ والہانہ محبت اور یہ ایمانی جرأت دیکھ کر تاریخ انگشت بدنداں ہے۔ تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح سکتے کے عالم میں کھڑی رہتی ہے اور پھر آگے بڑھ جاتی ہے۔ سامنے ہی رسول اللہ ﷺ اپنے عم محترم حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی لاش کے پاس کھڑے ہیں۔ ظالموں نے ان کی لاش کو بڑی بے دردی کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور ایسا مسخ کیا ہے کہ پہچاننا بھی دشوار ہے۔

زبیر ابن عوامؓ آتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ سے مخاطب ہوتے ہیں: ''یارسول اللہ!''

''کیا ہے زبیر ـــــ؟'' رسول اللہ ﷺ گلوگیر آواز میں دریافت فرماتے ہیں۔ ''امی جان آتی ہیں۔'' حضرت زبیرؓ بڑے ادب سے عرض کرتے ہیں: ''ماموں جان کی لاش دیکھنا چاہتی ہیں۔''

''لاش کی یہ حالت دیکھ کر وہ اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکیں گی۔'' رسول اللہ ﷺ نے سر اٹھاتے ہوئے فرمایا۔ ''ان سے کہو کہ واپس چلی جائیں۔''

حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمانِ نبویؐ اپنی والدہ ماجدہ کو پہنچا دیتے ہیں۔

''بیٹے ـــــ! حضورؐ سے جا کر عرض کرو کہ بھائی کی لاش کے ساتھ جو کچھ کیا گیا ہے وہ مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے۔'' حضرت صفیہؓ نے حضرت زبیرؓ سے کہنا شروع کیا۔ ''لیکن میں جانتی ہوں کہ یہ سب خدا کی راہ میں ہوا ہے۔ اس لیے صابر وشاکر ہوں اور ان شاء اللہ اس آزمائش میں بھی پوری اتروں گی۔''

حضرت زبیرؓ والدہ کا پیغام رسول اللہ ﷺ کو پہنچا دیتے ہیں۔ آپؐ آنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ حضرت صفیہؓ تشریف لاتی ہیں اور رنج وغم کی تصویر بنی ہوئی بھائی کی مثلہ کی ہوئی لاش کے قریب کھڑی ہو جاتی ہیں ـــــ فرطِ جذبات سے ہونٹ کانپنے لگتے ہیں مگر پاسِ اطاعت سے زبان خاموش ہے۔ آنکھوں سے چند آنسو ٹپک کر پتھریلی زمین میں جذب ہو جاتے ہیں۔

تاریخ اطاعت گزاری کے اس منظر کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے ـــــ آخر کار جب اس سے ضبط نہ ہو سکا تو وہ آنسو خشک کرتی ہوئی مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔

سنہ ۱۰ ہجری

تاریخ ماحول کا جائزہ لیتی ہوئی یمامہ کی حدود میں داخل ہوتی ہے۔ یمامہ مسیلمہ کذّاب کا علاقہ ہے،، جس نے اللہ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ مسیلمہ کے دربار میں آج غیر معمولی بھیڑ بھاڑ ہے۔

دربار حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے، جن میں کافی جوش و خروش پایا جاتا ہے۔
''ضرور کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے والا ہے۔'' تاریخ اندازہ لگاتے ہوئے حالات سے مخاطب ہوتی ہے۔

''معلوم ہوا ہے کہ آج حضرت حبیب بن زید بن عاصمؓ کا مقدمہ سرِ دربار پیش ہوگا۔'' حالات نے جواب دیا۔

''کیسا مقدمہ___!'' تاریخ حیرت کے ساتھ سوال کرتی ہے۔

''حبیبؓ نے مسیلمہ کو نبی ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ اسی لیے ان کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔'' واقعات نے مزید روشنی ڈالتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''اور آج عوام کے سامنے ان سے اقرار کرایا جائے گا۔''

''اور اگر وہ آج بھی انکار ہی کرتے رہے تو___؟'' حالات نے گھبرائے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

''سنا ہے کہ پھر ان کو ایسی عبرت ناک سزا دی جائے گی، جسے دیکھ کر ان کے ہم خیال لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔'' واقعات نے بات پوری کر دی۔

تاریخ خیالات میں ڈوبی خاموش کھڑی ہے کہ اتنے میں سپاہی ایک شخص کو لیے ہوئے دربار میں داخل ہوتے ہیں، جس کی مشکیں کسی ہوئی ہیں اور وزنی بیڑیوں کی وجہ سے پیر زخمی ہو گئے ہیں۔ تاریخ اپنے رفیقوں کے ساتھ راستے سے ہٹ کر ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہے۔ تخت کے قریب پہنچ کر سپاہی مسیلمہ کذاب کے سامنے جھک جاتے ہیں مگر قیدی نیزے کی طرح سیدھا کھڑا رہتا ہے۔ مسیلمہ کے اشارے پر اس کی مشکیں کھول دی جاتی ہیں۔

''اے ضدی انسان! تو نے کیا فیصلہ کیا؟'' مسیلمہ حضرت حبیبؓ سے مخاطب ہوتا ہے۔

''میرا فیصلہ تو تم کو پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت محمد ﷺ خاتم الانبیاء ہیں۔ نبوت کا سلسلہ آپؐ پر ختم ہو چکا ہے۔'' حضرت حبیبؓ بہت ہی بے باکانہ انداز میں جواب دیتے ہیں، جس کے ایک ایک لفظ سے عزم اور حوصلہ ٹپکتا ہے۔

''تو نے غور کر لیا ہے کہ اس ضد کا انجام کیا ہوگا؟'' مسیلمہ تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ پھر سوال کرتا ہے۔

حضرت حبیبؓ مسکراتے ہوئے فرماتے ہیں ع

لاکھ ناسازگاریِ حالات ہو، عزمِ نو سے کمر باندھ کر آئے ہیں
ہم کہ پروردۂ فیضِ خورشید ہیں، ہم ہی لے کر پیارِ سحر آئے ہیں

''گستاخ خاموش رہ! ورنہ تالو سے زبان کھینچ لی جائے گی۔'' مسیلمہ تلملا اٹھتا ہے۔

حضرت حبیبؓ سکون و خاموشی کے ساتھ مسیلمہ کو گھورنے لگتے ہیں۔ آپؓ کی خاموش زبانی جیسے یہ شعر دُہرا رہی ہو۔ ع

ہم سکوتِ مرگ کے قائل تو ہیں، اس کے نہیں
زندگی میں بند ہو جائے زبانِ زندگی

آپؓ کے اس بے باکانہ رویہ کو دیکھ کر مسیلمہ مارے غصے کے آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور چیخ اٹھتا ہے:

''اس گستاخ کا دایاں بازو قلم کر دو۔''

جلاّد آگے بڑھ کر ایسا کاری وار کرتا ہے کہ حضرت حبیبؓ کا بازو کٹ کر دور جا گرتا ہے اور خون کا فوارہ اُبلنے لگتا ہے۔

''بول اب کیا کہتا ہے، مجھے نبی مانتا ہے یا نہیں؟'' مسیلمہ کذاب حضرت حبیبؓ سے پھر مخاطب ہوتا ہے۔

''نہیں ـــ ہرگز نہیں ـــ تو جھوٹا ہے ـــ کاذب ہے۔'' ایک گرجدار آواز سارے دربار میں گونج اٹھتی ہے۔ حاضرین پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔

''اس کا دوسرا بازو بھی قلم کر دو۔'' مسیلمہ جلاد کو پھر حکم دیتا ہے۔

حکم کی تعمیل ہوتی ہے اور حضرت حبیبؓ کا بایاں بازو دوسری طرف جا گرتا ہے۔

''اللہ کا شکر ہے یہ بھی اسی کی راہ میں کام آیا۔'' تشکر کے جذبے میں ڈوبی ہوئی آواز دربار میں پھیل جاتی ہے۔ ہر شخص حیرت کے ساتھ حضرت حبیبؓ کو دیکھ رہا ہے، جو خون میں نہائے ہوئے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔

''حبیبؓ ـــ!! اب بھی میری نبوّت کا اقرار کر لو۔'' مسیلمہ کے لہجے میں تبدیلی آ چکی ہے۔

''اندھیرے کو اُجالا ـــ میں کیسے کہہ دوں۔'' حضرت حبیبؓ کی آواز میں اور زیادہ پختگی آ جاتی ہے۔

''اس کے پیر بھی قلم کر دو۔'' پھر فرعونی آواز سنائی دیتی ہے۔

جلاّد حضرت حبیبؓ کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں تک کاٹ دیتا ہے۔ آپ زمین پر لڑھک جاتے ہیں۔ دربار میں ہر طرف خون ہی خون ہے۔ مختلف سمتوں سے واویلا کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔

''اب بھی مان جا۔'' مسیلمہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔

''نبوت ختم ہو چکی ہے ـــ تو کذاب ہے۔'' حضرت حبیبؓ کے یہ کلمات اور زیادہ تیز آواز سے گونجتے ہیں۔

''اس کا کام تمام کر دو۔'' مسیلمہ کی آواز آخری بار سنائی دیتی ہے۔

جلاّد خون سے نہائی ہوئی تلوار لیے آگے بڑھتا ہے۔ حضرت حبیبؓ کی زبان پر استغفار

کے کلمات جاری ہو جاتے ہیں اور پھر والہانہ انداز میں اس مفہوم کے اشعار پڑھنے لگتے ہیں:

''اگر میں اس حالت میں قتل کیا جاتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو مجھے اس کی پروانہیں کہ کس پہلو پر مجھے قتل کیا گیا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہے۔ وہ اگر چاہے تو جسم کے کٹے ہوئے اور بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو بھی زندگی اور برکت عطا کر سکتا ہے۔''

جلاّد کا آخری وار حضرت حبیبؓ کے جسم اور سر کے رشتے کو ہمیشہ کے لیے جدا کر دیتا ہے۔

آپ کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ کھیل رہی ہے لیکن مسیلمہ کذّاب کے چہرے پر خوف و دہشت کی سیاہی چھلکنے لگتی ہے۔

''سچ ہے ___ حق قربانی چاہتا ہے۔'' تاریخ ایک ٹھنڈی سانس بھرتی ہے۔

''حق کا اظہار پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کا تاج ہے۔'' حالات کی بھرّائی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے۔

''صراطِ مستقیم ___ خارزاروں سے ہو کر گزرتی ہے۔'' واقعات نے بات پوری کر دی۔

تینوں سر جھکائے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ایک سمت کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ فضائیں یہ شعر گونجنے لگتا ہے۔ ع

سخت مشکل ہے رہِ عشق و یقیں پر چلنا
خارزاروں سے گزر کر یہ ڈگر جاتی ہے

سنہ ۶۱ ہجری

''ارے شبیہِ رسولؐ کیا مسافر تھے__!!'' واقعات کی نظر اُس قافلہ سالار پر پڑتی ہے، جو ۱۸۰ افراد کے مختصر قافلے کے ساتھ دریائے فرات کے کنارے پر پڑاؤ ڈالے پڑا ہے، جس میں لڑکے، بچے، بوڑھے، جوان اور عورتیں سب ہی شامل ہیں، جن کے چہرے آفتاب کی طرح دمک رہے ہیں۔

''تم نے خوب پہچانا۔'' تاریخ نے کہنا شروع کیا۔ ''یہ خاتم المرسلین ﷺ کے چھوٹے نواسے حضرت حسین ابن علیؓ ہیں۔''

''حسینؓ__! اور __ دریائے فرات کے کنارے __!'' واقعات کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔

''فرض نے ان کو آواز دی __ انھوں نے اس کی آواز پر لبیک کہا اور نکل کھڑے ہوئے۔'' تاریخ کا لب ولہجہ بہت ہی سنجیدہ ہے، جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی ہو۔

''آپ کے اشارات سمجھ میں نہیں آئے۔'' حالات نے چونک کر سوال کیا۔

''رسول اللہ ﷺ کی سنت پامال ہو رہی ہے اور قیصر وکسریٰ کے طریقوں کو رائج کیا جا رہا ہے۔'' تاریخ واقعات پر روشنی ڈالنے لگتی ہے۔ ''اس ظلم کو یہ مزاج شناسِ نبوت برداشت نہ کر سکا __ اور __ سر ہتھیلی پر رکھ کر نکل کھڑا ہوا۔''

''حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلافت کے داعی ہیں اور یزید ملوکیت کا علمبردار ہے۔'' واقعات نے بات کو صاف کر دیا۔

''ارے۔۔۔ یہ گرد کیسی اٹھ رہی ہے؟'' حالات نے کوفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سب کی نظریں اسی طرف اٹھ جاتی ہیں۔

''کوئی لشکر آ رہا ہے۔'' واقعات نے اس سمت غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

لشکر نزدیک ہوتا جا رہا ہے یہاں تک کہ لشکری صاف دکھائی دینے لگتے ہیں۔

''ارے۔۔۔۔ یہ تو یزید کا لشکر ہے!'' تاریخ کے اس جملے سے سب حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔

کچھ اور آگے بڑھ کر لشکر پڑاؤ ڈال دیتا ہے۔ حضرت حسین ابن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگاہیں فوجیوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر پر ہیں اور دل مصروفِ دعا ہے:

''اے اللہ۔۔۔۔! تو خود گواہ ہے کہ میرے قدم کسی ذاتی غرض کے لیے نہیں اُٹھے ہیں بلکہ تیرے دین پر جو ظلم ہو رہا ہے اسے مٹانے کے لیے میں نے اپنے خاندان کے ایک ایک فرد کی بازی لگا دی ہے۔ ہمارے ارادوں میں استقامت بخشنا اب تیرا کام ہے۔''

آپ ادھر دعا ختم فرماتے ہیں کہ ادھر عمر ابن سعد کا قاصد گھوڑا دوڑاتا ہوا آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور ادب کے ساتھ عرض کرتا ہے:

''آپ یہاں کیوں تشریف لائے ہیں؟''

اہلِ کوفہ نے مجھے خطوط لکھ کر حق کی حمایت کے لیے بلایا تھا۔ اس لیے مجھے آنا پڑا۔''

حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت ہی صفائی کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔

''آپ کو دھوکا دیا گیا ہے۔ یہاں آپ کی کوئی ضرورت نہیں۔'' قاصد مؤدبانہ عرض کرتا ہے۔

''خیر۔ اب اگر انھیں میری ضرورت نہیں ہے تو میں واپس جانے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے مسلمانوں کا کشت و خون پسند نہیں۔'' حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بات صاف کر دی۔

''لیکن اب آپ واپس تشریف نہیں لے جا سکتے۔'' قاصد کے لہجے سے تاسّف کا اظہار ہوتا ہے۔

''کیوں ــــ؟'' حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حیرت کے ساتھ سوال کیا۔

''ابنِ زیاد کا حکم ہے۔'' قاصد پورے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے جواب دینا شروع کرتا ہے۔ ''جب تک آپ اور آپ کے ساتھی یزید ابن معاویہ کی بیعت نہ کرلیں اس وقت تک آپ اس سرزمین کو نہیں چھوڑ سکتے۔''

''اور اگر میں بیعت نہ کروں ــــ تو؟'' حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت ہی ٹھنڈے انداز میں سوال کرتے ہیں۔

''مجھے کہنے کی اجازت دیں کہ پہلے قدم پر آپ حضرات کا پانی بند کر دیا جائے گا۔'' قاصد نے جواب دیا۔ ''آپ حضرات عثمان ابن عفانؓ کی طرح ایک ایک بوند کو ترسیں گے۔''

''اور پھر ــــ؟'' اسی طمانیت کے ساتھ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دوبارہ سوال کیا۔

''اس کے بعد ہماری تلواریں فیصلہ کریں گی۔'' قاصد بات پوری کر کے واپس چلا جاتا ہے۔

پانی بند ہوئے تین دن گزر چکے ہیں۔ پیاس کی شدت سے برا حال ہے۔ حلق میں کانٹے پڑ گئے ہیں۔ بڑے تو کسی نہ کسی طرح برداشت کر رہے ہیں لیکن بچوں کی حالت بہت ابتر ہے۔ رونے کی آواز بھی حلق خشک ہونے کی وجہ سے صاف نہیں نکل پاتی۔ حضرت حسینؓ اور ان کے ساتھی یہ ساری تکلیفیں صبر و شکر کے ساتھ برداشت کر رہے ہیں۔

رات توبہ و استغفار میں گزرتی ہے۔ صبح ہوتے ہی میدانِ کارزار گرم ہو جاتا ہے۔ آپ کے ساتھی فرداً فرداً جاتے ہیں اور دشمنوں کے دلوں پر اپنی شجاعت کا سکّہ بٹھا کر اپنے سے کئی گنا افراد کو موت کے گھاٹ اُتار کر جامِ شہادت نوش فرماتے ہیں۔ جیسے ہی وہ شہید ہو کر گرتے ہیں حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوڑ کر ان کے لاشے کو اُٹھا لاتے ہیں اور خیموں کے سامنے لٹا دیتے ہیں۔ اس طرح ایک ایک کر کے تمام اعزّا شہید ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ نومولود صاحبزادے کسی شقی کے تیر سے اُس وقت شہادت پاتے ہیں، جب کہ آپ کانوں میں اذان دینے کے لیے ان کو گود میں لے کر کھڑے ہوتے ہیں۔

آخر میں حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہ نفس نفیس میدان میں اُتر آتے ہیں۔ آپ

جس طرف اپنا گھوڑا بڑھاتے ہیں ایک تہلکہ مچ جاتا ہے۔ آپ کی تلوار سے دشمن اس طرح بچ بچ کر بھاگ رہے ہیں، جس طرح شیر کی بو پا کر جنگل کے دوسرے جانور بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ لڑائی کے دوران پیاس کی شدت سے بے چین ہو کر آپ گھوڑے کا رُخ دریائے فرات کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ ساحل پر پہنچ کر آپ پانی پینا ہی چاہتے ہیں کہ کسی ظالم کا تیر آپ کے حلق میں ترازو ہو جاتا ہے اور دہنِ مبارک سے خون کا فوّارہ چھوٹنے لگتا ہے۔ آپ واپس ہونا چاہتے ہیں کہ ایک گروہِ اشقیاء آپ پر ٹوٹ پڑتا ہے اور تیر و تلوار کے وار پے در پے ایسے کرتا ہے کہ آپ نڈھال ہو کر زمین بوس ہو جاتے ہیں۔ گرتے گرتے آپ کی آواز بلند ہوتی ہے۔ ''اے گروہِ اشقیاء! گواہ رہنا۔ میں نے جان دینا گوارا کر لی مگر غیر اسلامی طریقے سے چنے ہوئے خلیفہ کو نبیؐ کا جانشین اور مسلمانوں کا اُولی الامر تسلیم نہیں کیا۔''

بات پوری کرتے ہی آپ پر غفلت سی طاری ہو جاتی ہے۔ موقع پا کر ایک بد بخت آپ کا سرِ مبارک جسم اطہر سے جدا کر دیتا ہے۔ چند اور ظالم گھوڑوں کی ٹاپوں سے جسدِ مبارک کو روند کر ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں۔

اس حادثے سے زمین تھرّانے لگتی ہے۔ فضا پر سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے فرات بہتے بہتے رُک گیا ہو۔ خون میں نہائی ہوئی کربلا کی زمین سے شعلے اُٹھنے لگتے ہیں۔ شجر و حجر سے آہ و بکا کی صدائیں بلند ہوتی سنائی دیتی ہیں۔

''قابلِ رشک ہیں وہ ہستیاں، جو اپنی بے مثال قربانیوں سے شاہ راہِ حیات پر ایسے نشانِ منزل نصب کر جائیں، جو اُن کے بعد ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والے باہمت انسانوں کو صحیح سمت کا پتہ دے سکیں۔''

تاریخ کی آواز فضا میں گونجتی ہے، جس کے مدھم ہوتے ہی ایک لے اُبھرتی ہے ع

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

سنہ ۹۴ ہجری

زنجیروں اور رسیوں میں جکڑی ہوئی ایک جماعت حجاج کے دربار کی طرف کشاں کشاں لائی جارہی ہے۔ ان کے بوسیدہ کپڑے گرد میں اَٹے ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لمبی مسافت طے کرکے آرہے ہیں۔ سفر کی تکان اور سپاہیوں کے مظالم سے چہرے اُترے ہوئے ہیں۔ لیکن اُن میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے، جوان شدائد و مصائب سے بے نیاز صبر واستقامت کے مجسّمے بنے ہوئے ہیں۔ ان کی پیشانیاں نور سے چمک رہی ہیں۔

''ان فرشتہ صورت انسانوں نے کیا جرم کیا ہے؟'' واقعات تاریخ سے دریافت کرتے ہیں۔

''تم نہیں جانتے ــــــ؟'' تاریخ نے واقعات کو تعجب سے دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا: ''ان کا جرم حق کی حمایت ہے۔''

''بات صاف نہیں ہوئی۔ ذرا وضاحت کردیجیے۔'' حالات نے بھی دلچسپی لینی شروع کی۔

''حجاج بن یوسف ثقفی کے ظلم وستم اور جبر وتشدد کے خلاف آواز اٹھانے والوں کی انھوں نے حمایت کی ہے۔'' تاریخ نے جواب دیا۔

''وہ دیکھیے اس کی گردن اڑادی گئی۔'' حالات اس طرف اشارہ کرتے ہیں جہاں حجاج بیٹھا ہوا ہے اور اس کے سامنے گرفتارانِ بلا صف بستہ کھڑے ہوئے ہیں۔ ایک ایک کو حجاج کے سامنے پیش کیا جارہا ہے، جو معذرت کرلیتا ہے اُسے معاف کردیا جاتا ہے ورنہ موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا ہے۔

سب سے آخر میں رسول اللہ ﷺ کے مشہور تابعی حضرت سعید ابن جبیرؒ کی باری آتی ہے۔آپ کے چہرے پر بحالی ہے۔ کسی قسم کے خوف وہراس کا نام ونشان تک نہیں ہے۔آپ کی طمانیتِ قلبی جیسے زبانِ حال سے کہہ رہی ہو ع

صرف ایک خوفِ خدا وندِ حقیقی کے سوا
اور سب خوف وخطر دل سے نکالے ہوئے لوگ

''تمھارا نام کیا ہے؟'' حضرت سعیدؒ کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر حجاج غصے میں لال پیلا ہو جاتا ہے۔

''سعید ابن جبیرؒ۔'' حضرت سعید بہت ہی اطمینان سے جواب دیتے ہیں۔

''نہیں ـــــ'' حجاج جھلاّئے ہوئے انداز میں کہتا ہے۔''تو شقی ابن کسیر ہے۔''

''میری ماں تجھ سے زیادہ میرے نام سے واقف تھی۔'' حضرت سعیدؒ کا جواب طنز سے دیتے ہیں۔

''تیری ماں بھی شقی (بد بخت) ہے اور تو بھی۔'' انداز میں کرختگی بڑھتی جاتی ہے۔

''غیب کا حال جاننے والا صرف اللہ ہے۔'' سعیدؒ پھر بہت ہی مختصر اور دنداں شکن جواب دیتے ہیں۔

''بہ خدا ـــــ میں تیری طمانیت اور سکون کو بھڑکتے ہوئے شعلوں میں بدل دوں گا۔'' حجاج جیسے چڑ گیا ہو۔

''اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ کسی کو نفع ونقصان اور تکلیف وآرام پہنچانا تیرے اختیار میں ہے تو۔'' حضرت سعیدؒ اپنے سادہ اور شگفتہ انداز میں اس طرح جواب دینا شروع کرتے ہیں، جیسے کہ حجاج کی لن ترانیوں کو منہ چڑا رہے ہوں۔

''تو کیا ـــــ'' حجاج سے ضبط نہ ہو سکا۔ بات کاٹ کر بول اٹھتا ہے۔

''تو میں تجھے خدا سمجھتا اور سجدے کیا کرتا۔'' سادگی کے ساتھ آپ نے بات پوری کر دی۔

''حضرت محمد ﷺ کے بارے میں تیرا کیا عقیدہ ہے؟'' حجاج بات کا رُخ بدل دیتا ہے۔

''آپؐ خاتم المرسلین، رحمۃ للعالمین اور امامِ ہدایت ہیں۔'' حضرت سعیدؒ پر ایک کیف ساطاری ہو جاتا ہے۔

''حضرت علیؓ جنت میں ہیں یا دوزخ میں؟'' حجاج پھر ایک تیر پھینکتا ہے۔

''جب تک جنت اور دوزخ کی سیر نہ کی جائے اس کا جواب دینا ممکن نہیں۔'' حضرت سعیدؒ حجاج کے اس وار کو بھی خالی جانے دیتے ہیں۔

''تمھارے خیال میں خلفاء میں کون اچھا تھا؟'' حجاج نے دوسرا تیر پھینکا۔ ''اور موجودہ خلیفہ کیسا ہے؟''

''وہی اچھا ہے، جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کو خوش رکھا۔'' حضرت سعیدؒ صاف بچ جاتے ہیں۔

''تمھارے علم میں کس نے اللہ اور رسولؐ کو خوش رکھا؟ حجاج نے پھر پھانسنا چاہا ـــــ

''حجاج! غیب کا علم صرف خدا کو ہے۔ وہی اسے جانتا ہے۔'' حضرت سعیدؒ حجاج کو پھر بے دست و پا کر دیتے ہیں۔

حجاج کے اشارے پر موتیوں اور جواہرات سے بھرا ہوا طشت آپ کے سامنے لایا جاتا ہے۔

''اگر یہ مال و دولت آخرت کے عذاب کے لیے ڈھال بن جائے تو بہت مبارک ہے ورنہ یاد رکھ، قیامت کی گھبراہٹ اور پریشانی میں شیر خوار بچے کو بھی ماں فراموش کر دے گی۔'' حضرت سعیدؒ بہت ہی پر اثر انداز میں جواب دیتے ہیں۔

حضرت سعیدؒ کا جواب سن کر حجاج کچھ سوچنے لگتا ہے لیکن پھر دوسرے ہی لمحے وہ اپنے سر کو اس طرح جھٹکتا ہے، جیسے کہ اپنے ذہن سے کسی خیال کو نکال پھینکنا چاہتا ہو اور پھر گانا سننے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ ساز کی آواز سن کر ابن جبیرؒ زار و قطار رونے لگتے ہیں۔

''ہیں ـــــ یہ کیا ـــــ؟ رونے کا یہ کون سا موقع ہے؟'' حضرت سعیدؒ کو روتا ہوا دیکھ کر حجاج تعجب کے ساتھ سوال کرتا ہے۔

''باجے کی آواز سن کر مجھے صورِ اسرافیل کی یاد آ گئی۔'' حضرت سعیدؒ نے آنسو خشک کرتے

ہوئے جواب دیا: ''یاد رکھ! تیرا یہ گانا بجانا قیامت کے دن تیرے لیے وبالِ جان ثابت ہوگا۔''

''غارت ہو جائے تو اور تیرا تقویٰ۔'' حجاج جھلاّ اٹھتا ہے۔ حضرت سعیدؒ معنی خیز انداز میں حجاج کو اس طرح گھور کر دیکھتے ہیں کہ جیسے ان کی خاموشی زبانِ حال سے کہہ رہی ہو ؏

کتابِ کفر در بغل، خدا کا نام بر زباں

یہ زُہد ہے تو الحذر، یہ دین ہے تو الاماں

یہ خاموش جواب سن کر حجاج پیچ و تاب کھانے لگتا ہے اور مشتعل ہو کر چیخ اٹھتا ہے: ''معلوم ہوتا ہے کہ تو اپنی زندگی سے بیزار ہو چکا ہے۔ اچھا بتا۔۔۔ تجھے کس طرح قتل کیا جائے۔''

حجاج سمجھتا تھا کہ قتل کا نام سنتے ہی سعیدؒ کے رویّے میں تبدیلی آ جائے گی مگر یہ صرف اس کا گمان ہی ثابت ہوا۔۔۔ حضرت سعیدؒ مسکراتے ہوئے جواب دیتے ہیں: ''حجاج! جو طریقہ تو خود اپنے لیے پسند کرتا ہو اسی طرح مجھے قتل کر کیوں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تجھے بھی اسی طرح قتل کرائے گا۔''

''کیا تم معافی کی درخواست کرنا چاہتے ہو؟'' حجاج نے حضرت سعیدؒ کے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

''میری جاں بخشی تیرے اختیار میں نہیں ہے۔'' سکون و طمانیت میں ڈوبی ہوئی آواز دربار میں گونجتی ہے۔۔۔ ''جاں بخشی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے تو مجبورِ محض ہے۔''

''خاموش۔۔۔!ایک گرجدار آواز دربار کی دیواروں سے ٹکراتی ہے۔ ''تم حد سے آگے بڑھتے جا رہے ہو سعید!''

حضرت سعیدؒ کی طمانیت قلبی اور بے خوفی حجاج کے غیظ و غضب کا گویا یہ کہہ کر مذاق اڑا رہی ہو کہ ؏

تاج و ایوان کو ہے طیش، یہ حق گوئی کیوں

یوں، کہ اِس دور میں فطرت کی زباں ہیں ہم لوگ

''اِس کو لے جا کر قتل کر دو۔'' حجاج کھڑے ہوئے سپاہیوں سے مخاطب ہوتا ہے۔

حضرت سعیدؒ خوشی خوشی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور مسکراتے ہوئے سپاہیوں کے ساتھ چلنے لگتے ہیں۔

''حضور! یہ گستاخ قیدی آپ کے حکم پر مسکراتا ہے۔'' ایک سپاہی حضرت سعیدؒ کی شکایت کرتا ہے۔

حجاج حضرت سعیدؒ کو بلا کر ہنسنے کی وجہ دریافت کرتا ہے۔

''مجھے تیرے تکبر اور اللہ تعالیٰ کے تحمل و بے نیازی پر ہنسی آتی ہے۔'' حضرت سعیدؒ بے باکانہ انداز میں جواب دیتے ہیں۔

'اس کو ہمارے سامنے قتل کرو۔'' حجاج جلاّد سے مخاطب ہوتا ہے۔

حضرت سعیدؒ یہ حکم سن کر نہایت اطمینان سے قبلے کی طرف رُخ کر کے توبہ و استغفار میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ حجاج آپ کی طمانیت کو دیکھ کر تلملا اٹھتا ہے اور سپاہیوں کو حکم دیتا ہے:

'اس کا منہ قبلہ کی طرف سے پھیر دو۔''

سپاہی حکم کی تعمیل کرتے ہیں اور حضرت سعیدؒ کو اوندھا لٹا دیتے ہیں۔ آپ سر اٹھاتے ہیں اور پورے جلال کے ساتھ فرماتے ہیں ع

سن اے شب دیجور! اُجالوں کے پرستار
تابندہ تھے، تابندہ ہیں، تابندہ رہیں گے

''اس کی زبان بند کر دو۔'' پھر حجاج کی گرج دار آواز سنائی دیتی ہے۔

حضرت سعید ابن جبیرؒ بہ آواز بلند کلمہ پڑھتے ہوئے رب العزت کی بارگاہ میں دُعا فرماتے ہیں:

''اے اللہ! میرے بعد اس ظالم کو کسی اور کے قتل کا موقع نہ دے۔''

اِدھر دُعا کے کلمات ختم ہوتے ہیں اُدھر رشتۂ حیات منقطع ہو جاتا ہے۔ تن اور سر دونوں الگ الگ پڑے ہوئے ہیں۔ دربار میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ آپ کے جسم سے غیر معمولی طور پر اتنا خون بہہ رہا ہے کہ آج تک کسی مقتول کے نہیں بہا ہے۔ حجاج اور اس کے درباری حیرت میں ہیں۔ ایک آواز دربار میں گونجتی ہے:

''موت کا خوف خون خشک کر دیتا ہے لیکن سعید ابن جبیرؒ کے لیے ع
موت اک ماندگی کا وقفہ ہے ___ یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر''

تاریخ خیالات میں کھوئی ہوئی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ایک طرف روانہ ہو جاتی ہے۔ حالات اور واقعات اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ دوسری طرف سے کسی کی درد بھری آواز سنائی دیتی ہے ع

وہ سر تو ایک فتحِ مبین حیات ہے
جو کٹ گیا ہو، پیشِ ستمگر جھکا نہ ہو

سنہ ۱۴۷ ہجری

''مدینہ منورہ کی فضا اتنی سوگوار کیوں ہے؟'' حالات نے تاریخ سے دریافت کیا۔

''در و دیوار سے رنج و غم کیوں ٹپک رہا ہے؟'' واقعات نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مدینہ کو خون کے آنسو رونا چاہیے۔'' تاریخ کی آواز جیسے حلق میں پھنس رہی ہو۔

''کیوں۔۔۔ کیا ہوا؟'' واقعات نے پھر سوال کیا۔

''تعجب ہے۔۔۔ تمھیں نہیں معلوم۔'' تاریخ نے کہا۔

''آخر ہوا کیا۔۔۔؟'' حالات نے اپنی بڑھتی ہوئی بے چینی کو چھپاتے ہوئے کہا۔

''حضرت امام مالکؒ کو کوڑوں سے زدوکوب کیا گیا ہے۔'' تاریخ نے فضا میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔

''امام مالکؒ کو۔۔۔!'' دونوں کی زبان سے بیک وقت نکل گیا۔

''ہاں ہاں۔۔۔ مالک ابن انسؒ کو۔۔۔'' تاریخ اب بھی اسی طرف کو گھورے جا رہی ہے۔

''آخر کیوں۔۔۔؟'' دونوں کا تجسس بڑھتا جاتا ہے۔

''خلیفہ کے سیاسی ہتھکنڈے کے خلاف امامِ وقت نے فتویٰ جاری کر دیا۔'' تاریخ واقعات پر روشنی ڈالنے لگتی ہے۔ ''عوام میں کھلبلی مچ گئی۔۔۔ اقتدار بوکھلا اٹھا۔۔۔ اس کا گرگا۔۔۔ مدینے کا گورنر تلملا اٹھا۔ اس نے فتویٰ واپس لینے کا مشورہ دیا۔۔۔''

''کیا امام صاحب نے فتویٰ واپس لے لیا ــــ؟'' حالات بات کاٹتے ہوئے دریافت کرتے ہیں۔

''بھلا یہ کیسے ممکن تھا ــــ!'' تاریخ جواب دیتی ہے۔

''پھر کیا ہوا ــــ؟'' واقعات نے سوال کیا۔

''وہی ہوا ــــ جو ہونا چاہیے تھا۔'' تاریخ جواب دیتی ہے۔

یعنی ــــ؟'' وضاحت طلب انداز میں حالات استفسار کرتے ہیں۔

''والیِ مدینہ غصے میں آپے سے باہر ہو گیا۔ امام مالکؒ کو بلا کر کوڑوں سے مدارات کی۔'' تاریخ کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

''اُف ــــ!! ظلم ــــ صریح ظلم!'' دونوں یک زبان ہو کر بول اٹھتے ہیں۔

''وہ دیکھو! ــــ ظالم انھیں پھر لیے جا رہے ہیں۔'' تاریخ ایک طرف اشارہ کرتی ہے۔

دونوں کی نظریں اس طرف اٹھ جاتی ہیں۔ چند سپاہی امام مالکؒ کو پیچھے سے ہتھکڑیاں لگائے ہوئے لے جاتے نظر آتے ہیں۔ اُن کا رُخ والیِ مدینہ کے مکان کی طرف ہے۔

''دیکھو تو کتنا کس کر ہاتھوں کو باندھا گیا ہے۔'' حالات اشارہ کرتے ہیں۔

''درندے ہو گئے ہیں ــــ درندے۔'' واقعات بات پوری کر دیتے ہیں۔

امام مالک سر جھکائے چلے جا رہے ہیں۔ آپ کے پیچھے سیکڑوں کی تعداد میں لوگ اُمڈے چلے آ رہے ہیں۔ سپاہیوں کے روکنے کے باوجود بھیڑ کم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ پیچھے آنے والے رنج و غم کی زندہ تصویر بنے ہوئے ہیں۔ بعض کی آنکھوں میں آنسو تک تیرتے نظر آ رہے ہیں۔ تاریخ بھی اپنے دونوں رفیقوں کے ساتھ مجمع میں شریک ہو جاتی ہے۔

والیِ مدینہ کے مکان پر پہنچ کر عوام باہر رہ جاتے ہیں اور سپاہی امام مالکؒ کو ساتھ لیے ہوئے اندر چلے جاتے ہیں۔ جعفر ابن سلیمان والیِ مدینہ کی نظر جوں ہی امام مالکؒ پر پڑتی ہے وہ آپ سے مخاطب ہوتا ہے:

''مجھے امید ہے کہ آپ نے اپنی رائے بدل دی ہوگی۔''

''یہ فقط امیدِ موہوم ہے۔'' امام مالکؒ پورے عزم کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔

''یہ ضد آپ کے لیے...''

جعفر کا جملہ پورا بھی نہیں ہونے پاتا ہے کہ امام مالکؒ بول اٹھتے ہیں:

''یہ ضد نہیں ــــ اظہارِ حق ہے۔''

''بہر حال کچھ بھی سہی ــــ مگر یہ سودا بہت مہنگا پڑے گا۔'' جعفر اپنا جملہ پورا کر دیتا ہے۔

''موت صرف ایک مرتبہ آتی ہے ــــ بار بار نہیں آتی۔'' امام مالکؒ کے لہجے میں پختگی اور اولوالعزمی پائی جاتی ہے۔

جعفر یہ جواب سن کر تلملا اُٹھتا ہے۔

''اس کے دونوں ہاتھ اور کس کر باندھ دو۔'' وہ سپاہیوں کو حکم دیتا ہے۔ ''اور کرُتا بھی اُتار دو۔''

سپاہی حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ہاتھ اتنے کھینچ کر باندھتے ہیں کہ دونوں شانے اتر جاتے ہیں۔ ننگی پیٹھ پر کوڑوں کے نشانات صاف دکھائی دیتے ہیں۔

''اگر تم اپنا فیصلہ بدل دو تو اب بھی معاف کیے جا سکتے ہو۔'' جعفر کی آنکھیں غصے میں سرخ ہو رہی ہیں۔

''جو مجھے کہنا تھا وہ میں کہہ چکا کہ جبری طلاق درست نہیں۔'' امام مالکؒ بڑے پرسکون اور باوقار لہجے میں جواب دیتے ہیں۔

''کوڑے لگانا شروع کر دو۔'' جعفر حکم دیتا ہے۔

حکم ملتے ہی امام مالکؒ کی ننگی اور زخمی پیٹھ پر کوڑے برسنا شروع ہو جاتے ہیں۔ آپ پورے صبر و استقامت سے ضربوں کو برداشت کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی نچلے ہونٹ کو دانتوں سے دبا کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں، جس سے آپ کی قلبی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

''اور زور سے۔'' جعفر کی آواز پھر گونجتی ہے۔

دوسرا تازہ دم سپاہی آگے بڑھ کر پہلے کی جگہ لے لیتا ہے۔ کوڑے کی ضرب میں اور

شدت آ جاتی ہے، جس کی وجہ سے امام مالک کی کمر دُہری ہوئی جاتی ہے مگر زبان خاموش ہے۔ البتہ کوڑوں کی سنسناہٹ کے درمیان توبہ و استغفار اور دعا کے کلمات ضرور سنائی دیتے ہیں۔ گوشت جگہ جگہ سے پھٹ جاتا ہے۔ جسم لہولہان ہو جاتا ہے۔ کوڑوں کی تعداد جب ستر تک پہنچ جاتی ہے، تو جعفر کی آواز پھر سنائی دیتی ہے۔

''رُک جاؤ!''

سپاہی کا اٹھا ہوا ہاتھ رُک جاتا ہے۔

''اونٹ کی ننگی پیٹھ پر بٹھا کر مدینے کی ایک ایک گلی میں ان کی تشہیر کراؤ۔''

امام مالکؒ کو باہر لا کر اسی حال میں اونٹ پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ ایک سپاہی نکیل پکڑے ہوئے مدینے کی گلیوں گلیوں میں اونٹ کو لے جاتا ہے ــــ اس خستہ حالی کے باوجود یہ مردِ مومن اظہارِ حق سے نہیں چوکتا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد عزیمت و استقامت میں ڈوبی ہوئی آواز مسلسل بلند ہوتی سنائی دیتی ہے۔

''لوگو! مجھے پہچان لو۔ میں مالک بن انس ہوں اور گواہ رہو کہ میں نے کل بھی یہی کہا تھا کہ جبری طلاق درست نہیں ہے۔ آج بھی اسی کا اعلان کر رہا ہوں اور ان شاء اللہ کل بھی یہی کہوں گا کہ جبری طلاق، طلاق نہیں ہے۔''

آپ کے اونٹ کے پیچھے پیچھے ایک جم غفیر ہے۔ ہر شخص کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور سسکیوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔

اونٹ ایک گلی میں مڑ جاتا ہے۔ تاریخ اندوہ و غم کا مجسمہ بنی ہوئی سر جھکائے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی دوسری سمت کو چلی جاتی ہے۔ ایک گنگناہٹ سی فضا میں سنائی دیتی ہے۔ ع

جان ہتھیلی میں رکھ لے
کہنا ہے گر سچی بات

کیا مسافر تھے___!

سنہ ۲۱۹ ہجری

رمضان شریف کا آخری عشرہ ہے۔ بغداد کے قید خانے کے آہنی پھاٹک پر ایک ہجوم اکٹھا ہے۔ ہر شخص کے چہرے سے فکر والم کے احساسات نمایاں ہیں۔ تاریخ بھی اپنے دونوں مصاحبوں کے ساتھ ایک طرف کھڑی حالات کا جائزہ لے رہی ہے۔ اتنے میں ایک خوف ناک آواز کے ساتھ قید خانہ اپنا آہنی جبڑا کھول دیتا ہے۔ عوام میں اضطراب و بے چینی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ کسی دردمند دل سے یہ آواز بلند ہوتی ہے۔ ؏

فصلِ گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی قیدی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

جلاّد نما سنتری ایک خوب صورت، میانہ قد، دُبلے پتلے اور ضعیف شخص کو اپنے نرغے میں لیے ہوئے پھاٹک سے باہر آتے ہیں۔ اس کے کمزور پیروں میں چار چار وزنی بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں، جن کے وزن سے قدم اٹھانا بھی اس کے لیے مشکل ہو رہا ہے۔ عوام کی نظریں جوں ہی اس فرشتہ صورت انسان پر پڑتی ہیں تو اُسے اس کس مپرسی کی حالت میں دیکھ کر اُن کے دلوں میں وقت کے جابر اقتدار کے خلاف نفرت اور غم و غصے کے جذبات اُبھر آتے ہیں۔ وہ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگتے ہیں لیکن ___ اس کے باوجود ان میں اتنی ہمت نہیں معلوم ہوتی کہ اس ظلم کے خلاف وہ کوئی آواز بلند کر سکیں۔

قید خانے کے سنتری اس باوقار قیدی کو باہر کھڑے ہوئے سپاہیوں کے سپرد کر دیتے

ہیں، جو اُسے اپنی حفاظت میں لیے ہوئے پابجولاں دربارِ خلافت کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے عوام کی ایک اچھی خاصی بھیڑ ہے، جو ہر ہر قدم پر بڑھتی ہی جاتی ہے۔ تاریخ بھی سر جھکائے رنج وغم کا مجسمہ بنی ان کے پیچھے ہو لیتی ہے۔ اس مردِ مجاہد کی آنکھیں بار بار آسمان کی طرف اُٹھ جاتی ہیں، جیسے وہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہوں ع

به جرمِ عشق تو ام می کشند غوغا ایست

تو نیز برسرِ بام آ، عجب تماشا ایست

سپاہی قیدی کو لیے ہوئے دربارِ خلافت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ بھیڑ باہر رہ جاتی ہے۔ عوام مختلف طریقوں سے اپنے غم وغصے کا اظہار کر رہے ہیں۔ لیکن محل میں داخل ہونے کی کسی میں ہمت نہیں۔ تاریخ کسی نہ کسی طرح محل کے اندر پہنچ جاتی ہے۔ سامنے تخت پر خلیفہ المعتصم باللہ عباسی بیٹھا ہوا ہے۔ غصے کی وجہ سے چہرے پر شکنیں پڑی ہوئی ہیں۔ دوسری طرف تن ومند دیو قامت جلادوں کا ایک دستہ کھڑا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ بیڑیوں کے بوجھ کی وجہ سے لڑکھڑاتے ہوئے، سپاہیوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ دربار کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ معتزلہ علماء اور سردار سب کے سب دربار میں موجود ہیں۔ جب آپ خلیفہ کے نزدیک پہنچ جاتے ہیں تو خلیفہ آپ کو اپنے پاس ہی بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے۔ ایک دفعہ پھر دربار میں سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر دم لے کر امام صاحب خلیفہ سے استفسار کرتے ہیں۔

''مجھے دوبارہ کیوں بلایا گیا ہے؟''

''آپ کی حالتِ زار پر مجھے رحم آتا ہے۔'' خلیفہ کی آواز دربار میں گونجتی ہے۔ ''آپ اپنے آپ کو ہلاکت میں کیوں ڈال رہے ہیں؟''

''مجھے بھی یہی فکر ہے۔'' امام صاحبؒ کی پرسکون مگر نحیف آواز سنائی دیتی ہے۔ ''اسی لیے خود کو آخرت کی ہلاکت سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''شاید آپ نے علمی اور منطقی دلائل پر غور نہیں فرمایا۔'' قاضی احمد ابن داؤد امام صاحب سے مخاطب ہوتے ہیں۔

''ایسا نہیں ہے۔'' امام احمدؒ جواب دیتے ہیں۔ ''میں نے علم کی روشنی میں ان دلائل پر اچھی طرح غور کرلیا ہے لیکن وہ میرے فیصلے کو بدل نہ سکے۔''

''یعنی تم یہ تسلیم کرنے کے لیے اب بھی تیار نہیں ہو کہ قرآن مخلوق ہے۔'' خلیفہ کی گرجدار آواز پھر دربار میں گونجتی ہے۔

''میں خلق قرآن کے عقیدے کو ماننے کے لیے تیار ہوں۔'' امام صاحبؒ کی زبان سے یہ کلمات سن کر سب کے چہروں پر خوشی کی لہر سی دوڑ جاتی ہے۔

''لیکن___''

''لیکن کیا___؟'' خلیفہ بات کاٹ کر سوال کرتا ہے۔

''قرآن یا حدیث سے اس کا کوئی ثبوت مجھے دکھا دیا جائے۔'' امام صاحبؒ کا یہ جملہ سن کر پھر سب کے چہرے لٹک جاتے ہیں۔ جیسے لہلہاتی ہوئی کھیتی پر اوس پڑ گئی ہو۔

''احمدؒ___ تم کو خدا سمجھے۔'' خلیفہ کی جھلاّئی ہوئی آواز پھر گونجی۔

''خدا کے لطف و کرم سے مجھے اسی کی توقع ہے۔'' امام صاحبؒ ذو معنی الفاظ میں برجستہ جواب دیتے ہیں۔

''خاموش___!'' خلیفہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو جاتا ہے۔ ''تم اپنی ضد سے باز نہ آؤ گے؟

''بغیر کسی نقلی دلیل کے میں اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔'' امام صاحبؒ کی پرسکون اور غیر متزلزل آواز پورے دربار میں پھیل جاتی ہے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا اور سننے والوں نے سنا کہ آپ کا عزم اور آپ کی استقامت وقت کے اقتدار کو زبانِ حال سے للکار اٹھی۔

کبھی نہ ظلم سے خم ہوگی یہ جبینِ نیاز
لہو برستی ہوئی، ظلم کی گھٹا کی قسم

المعتصم باللہ عباسی امام احمد بن حنبلؒ کے یہ تیور دیکھ کر مارے غصے کے تلملا جاتا ہے اور

سپاہیوں کو حکم دیتا ہے:

''اس کو کھینچو اور کرتہ اتار لو۔''

حکم کی دیر تھی۔ سپاہی چیونٹیوں کی طرح امام صاحب کو لپٹ جاتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے آپ کو برہنہ کر دیتے ہیں۔ جسمِ لاغر پر صرف تہبند رہ جاتا ہے۔ خلیفہ بذاتِ خود جلّادوں کے کوڑوں کا معائنہ کرتا ہے اور پھر امام صاحب سے مخاطب ہوتا ہے:

''احمد ــــــ! خدا گواہ ہے کہ میرے دل میں تمھارا بڑا احترام ہے۔ اگر تم خلق قرآن کا اقرار کر لو تو خدا کی قسم، اپنے ہاتھوں سے تمھارے پیروں کی بیڑیاں کھول دوں گا۔'' خلیفہ کی آواز میں قدرے رقت پائی جاتی ہے۔

''معتصم ــــــ! خدا کی کتاب یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے اس کا ثبوت پیش کر دو تو میں اقرار کرنے کو تیار ہوں۔'' امام صاحبؒ کی آواز میں اب بھی وہی پختگی پائی جاتی ہے۔

خلیفہ جلّادوں کو اشارہ کر دیتا ہے۔ ہر جلّاد عجب وحشیانہ انداز میں آگے بڑھتا ہے اور پوری قوت سے دو کوڑے لگا کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ امام صاحب نصب کیے ہوئے ستون کی طرح اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ پہلے کوڑے پر آپ نے ''بسم اللّٰہ'' کہا۔ دوسرے کوڑے پر آپ لا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ۔ توکلت علی اللّٰہ۔ و ھذا فی رضی اللّٰہ۔ (اللہ کے سوا کوئی طاقت وقوت والا نہیں ہے۔ میں اللہ پر بھروسا کرتا ہوں اور میرے بارے میں اس کی مرضی یہی ہے) پڑھتے ہیں۔ تیسرے کوڑے پر آپ بہ آواز بلند خلیفہ کی طرف رُخ کر کے فرماتے ہیں: القرآن کلام اللّٰہ غیر مخلوق (قرآن شریف اللہ تعالیٰ کا غیر مخلوق کلام ہے) یہ کلمات سن کر خلیفہ اور زیادہ سختی سے ضربیں لگانے کا حکم دیتا ہے۔ چوتھے کوڑے پر آپ قرآنِ پاک کی یہ آیت تلاوت فرماتے ہیں: قُلْ لَنْ یُّصِیْبَنَا اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا (کہو کہ جو کچھ خدا نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے اس کے سوا کوئی مصیبت ہم کو نہیں پہنچ سکتی)۔

اسی طرح ہر کوڑے پر موقع موقع کی آیاتِ قرآنی آپ تلاوت فرماتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی جگہ کی کھال پھٹ جاتی ہے۔ خون رسنے لگتا ہے۔ تہبند خون کی چھینٹوں سے داغ دار

ہو جاتا ہے۔ آپ صبر و استقامت کا مجسمہ بنے کھڑے رہتے ہیں۔ روزے کی حالت میں یہ صعوبتیں ___! الامان ___ الحفیظ ___! جب کوڑوں کی تعداد ۲۹ تک پہنچتی ہے تو آپ پر غنودگی سی طاری ہونے لگتی ہے۔ نیم وا آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے آپ بہ زبانِ حال عرض کر رہے ہوں۔ ع

سہہ رہا ہوں اہلِ باطل کی جفا تیرے لیے
اے خدا تیرے لیے، میرے خدا تیرے لیے

آخر کار آپ بے ہوش ہو کر گر پڑتے ہیں۔ جلاّد آپ کو اٹھا کر ایک کوٹھری میں ڈال دیتے ہیں اور پھر پیروں سے آپ کے خستہ جسم کو خوب ہی خوب روندتے ہیں۔

تاریخ اس وحشیانہ اور ظالمانہ حرکت کو برداشت نہ کر سکی۔ آخر کار اس کی آنکھیں بھی چھلکنے لگیں اور وہ آنسو خشک کرتی ہوئی باہر چلی جاتی ہے۔ کوٹھری میں امام صاحبؒ کا روندا ہوا جسم بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے۔ اس کا رواں رواں زبانِ حال سے پکار رہا ہے ع

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم، تجھے یادگار بنا دیا

کیا مسافر تھے___!

سنہ ۱۲۸۱ ہجری

تاریخ اپنے مصاحبوں کے ساتھ انبالہ کے ایک مشہور بازار سے گزر رہی ہے۔ انبالہ والے جوق در جوق ایک طرف کو تیزی کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے چلے جارہے ہیں۔

''یہ لوگ آخر کہاں جارہے ہیں؟'' حالات اپنے ساتھی سے مخاطب ہوتے ہیں۔

''ان کا رُخ تو انبالہ کورٹ کی طرف ہے۔ واقعات جواب دیتے ہیں۔

''آج کیا تاریخ ہے___؟'' تاریخ اس انداز سے سوال کرتی ہے جیسے کہ وہ کچھ یاد کر رہی ہو۔

''مئی کی دو تاریخ ہے۔'' حالات جواب دیتے ہیں۔

''اسی لیے تو لوگ اُمڈے چلے جارہے ہیں۔'' تاریخ اس طرح مخاطب ہوتی ہے کہ جیسے اسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی ہو۔

''آخر بات کیا ہے؟'' حالات پھر سوال کرتے ہیں۔

''تم بھی بھول گئے___!! تاریخ حیرت کا اظہار کرتی ہے۔''آج تحریکِ مجاہدین کے جاں بازوں کے مقدمے کا فیصلہ سنایا جائے گا۔''

''آپ کورٹ نہیں چلیں گی___؟'' واقعات سوال کرتے ہیں۔

''کیوں نہیں___ ضرور چلوں گی۔'' تاریخ کے لہجے سے شوق اور تڑپ کے ملے جلے جذبے کا اظہار ہوتا ہے۔

تینوں انبالہ کورٹ کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ عدالت کا کمرہ عوام سے کھچا کھچ بھرا

ہوا ہے۔ سامنے ہی کرسی پر انگریز جج ایڈورڈ بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے پہلو میں چار اسیسر بھی بیٹھے ہوئے ہیں، جو شہر کے سربرآوردہ اور معزز طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

دوسری طرف ملزموں کے کٹہرے میں چند قیدی کھڑے ہوئے ہیں، جن کے چہرے بشرے سے شرافت اور بے گناہی ٹپک رہی ہے۔ انھیں میں محمد جعفر تھانیسری اور مولانا یحییٰ علی صادق پوری بھی شامل ہیں۔ اول الذکر ابھی جوان ہیں اور مؤخر الذکر بہت سن رسیدہ ہیں۔ کمرے میں سناٹا چھایا ہوا ہے لیکن ہر شخص کے چہرے سے اضطراب اور بے چینی کا اظہار ہو رہا ہے۔ جج کے فیصلے کا بے تابی کے ساتھ انتظار ہے۔ تاریخ اپنے دونوں رفیقوں کے ساتھ ایک طرف کھڑی ہوئی یہ منظر دیکھ رہی ہے۔ خود اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ اس کی اندرونی ہلچل کا پتہ دے رہا ہے۔

''تم نے اپنی ذہانت اور علم کو حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے استعمال کیا تھا۔'' جج کی آواز یکبارگی کمرے میں گونجتی ہے اور ہر شخص اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ ''مجاہدین کے مرکز تک مالی امداد اور رضا کار پہنچانے میں تم درمیانی کڑی تھے۔ تم نے اب تک اپنے اس جرم کی تردید بھی نہیں کی ہے۔''

جج ایک طائرانہ نظر عوام پر ڈالتا ہے اور پھر ملزموں سے مخاطب ہوتا ہے۔

''اس لیے میں محمد جعفر اور یحییٰ علی کے لیے پھانسی کی سزا تجویز کرتا ہوں۔ ان کی ساری جائیداد اور املاک بھی بحق سرکار ضبط کی جاتی ہے۔ پھانسی کے بعد ان کی لاش ان کے ورثا کے حوالے نہ کی جائے گی بلکہ بدنصیبوں کے قبرستان میں انتہائی ذلت کے ساتھ دفن کر دی جائے گی۔''

جج سانس لینے کے بعد پھر فیصلہ سنانا شروع کرتا ہے:

''میں ان کو پھانسی کے تختے پر لٹکتا ہوا دیکھ کر بے حد خوش ہوں گا۔ باقی ملزموں کو عمر قید کی سزا دی جاتی ہے۔''

محمد جعفر اور مولانا یحییٰ علی پورے سکون اور وقار کے ساتھ فیصلہ سنتے ہیں۔ پھانسی کی سزا سن کر اُن کے چہرے فرطِ مسرت سے دمک اٹھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جنت اور اس کی

نعمتیں مجسم ہو کر اُن کے سامنے آ گئی ہوں اور وہ اُن سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ مولانا محمد جعفر کی زبان سے بے ساختہ یہ شعر نکل جاتا ہے اور پھر وہ والہانہ انداز میں جھومنے لگتے ہیں ع

للہ الحمد کہ آں چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید

یہ دونوں بزرگ جذبۂ شہادت میں اتنے سرشار ہیں کہ اُن کے اِس عالم کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ وہ پھانسی کے فیصلے کو بالکل اہمیت نہیں دیتے بلکہ الٹا اس کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ اُن کی یہ کیفیت دیکھ کر جج غصے سے بے قابو ہو جاتا ہے اور دانت پیستے ہوئے محمد جعفر سے مخاطب ہوتا ہے:

''پھانسی کا حکم سن کر تم بہت خوش نظر آتے ہو، کیا تمھیں اپنی جان پیاری نہیں؟''

''سارے انسانوں کی جانیں اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہیں۔'' محمد جعفر بے باکانہ انداز میں جواب دینا شروع کرتے ہیں۔ ''وہی مارتا اور وہی جلاتا ہے۔ تمھارے ہاتھ میں نہ زندگی ہے نہ موت۔ موت کا ایک دن مقرر ہے، جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس سے قبل وہ آ نہیں سکتی اور اس کے آنے کو کوئی روک نہیں سکتا۔''

یہ جواب سن کر جج اور چراغ پا ہو جاتا ہے لیکن کیا کرے، بے بس ہے۔ وہ اپنے ترکش کا آخری تیر بھی چلا چکا تھا۔ عوام حیرت زدہ ہیں۔ بعض کی آنکھیں پرنم ہیں اور بعض مجسمۂ حیرت بنے دونوں بزرگوں کے منہ تک رہے ہیں۔ اتنے میں ایک انگریز افسر پارسن آگے بڑھ کر مولانا یحییٰ علی سے مخاطب ہوتا ہے:

''میں نے آج تک ایسا منظر نہیں دیکھا۔ تم کو پھانسی کا حکم سنایا گیا ہے اور تم ایسے خوش اور مطمئن ہو کہ جیسے تم کو پھانسی کے تختے سے اتار لیا گیا ہو۔''

''ہم خوش کیوں نہ ہوں۔ ہمارا رب ہمیں شہادت کے شرف سے نوازنے جا رہا ہے۔''

مولانا سراپا جذبۂ تشکر بنے ہوئے جواب دیتے ہیں: ''تم بے چاروں کو اس کا مزہ کیا معلوم۔''

جواب پورا کر کے مولانا عربی کے وہ اشعار ذوق و شوق سے پڑھنے لگتے ہیں، جو حضرت حبیبؓ کی زبان پر شہید ہوتے وقت جاری تھے۔

''اگر میں اس حالت میں قتل کیا جاتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو مجھے اس کی پروا نہیں کہ کس پہلو پر مجھے قتل کیا گیا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہے۔ وہ اگر چاہے تو جسم کے کٹے ہوئے اور بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو بھی زندگی اور برکت عطا کر سکتا ہے۔''

ان دونوں کو جیل خانے بھیج دیا جاتا ہے اور ایسی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں الگ الگ رکھا جاتا ہے، جن میں روشنی اور تازہ ہوا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود دونوں بہت ہی خوش و خرم ہیں۔ تاریخ بھی اُن کی یہ والہانہ کیفیت دیکھ کر انگشت بدنداں ہے۔ اُس کی نظروں کے سامنے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ابتدائی دور گھوم جاتا ہے۔

''دیکھا تم نے ___؟'' وہ اپنے رفیقوں سے مخاطب ہوتی ہے۔ ''رضائے الٰہی کے شیدائی ایسے ہوتے ہیں۔''

''شہادت کو اللہ کی سب سے بڑی نعمت سمجھنے والوں کے لیے خوف و ہراس کیسا؟'' واقعات تبصرہ کرتے ہیں۔

''شہادت کی موت ان کے لیے سب سے بڑی سعادت ہے۔'' حالات جملہ پورا کر دیتے ہیں۔

''وہ دیکھو ___!'' تاریخ ایک طرف اشارہ کرتی ہے۔ ''ان میں دہشت اور خوف کا جذبہ اُبھارنے کے لیے جیل کے جلّاد ان کے سامنے پھانسی کا پھندہ تیار کر رہے ہیں۔''

''نادان یہ نہیں جانتے ___'' جلّادوں کی طرف دیکھتے ہوئے واقعات کہنا شروع کرتے ہیں۔ ''اِس قسم کے مناظر تو ان کے ایمان میں اور بالیدگی پیدا کرتے ہیں۔''

''دنیا ہی کو سب کچھ سمجھنے والوں میں اتنی بلندیِ فکر کہاں۔'' حالات طنز کرتے ہیں۔

پھانسی کے دن جتنے قریب آتے جاتے ہیں ان دونوں کی وارفتگی اور شوقِ ملاقات میں مزید اضافہ ہوتا جاتا ہے ؎

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک
آتشِ عشق تیز تر گردد

ان کی اس گرم جوشی اور وارفتگی کی اطلاعات انگریز حکام کو برابر پہنچتی رہتی ہیں، جنھیں سن سن کران کا جذبۂ انتقام اور غصہ مزید بڑھتا جاتا ہے۔ ان دونوں کی مسرت اور خوشی اُن پر شاق گزر رہی ہے۔ وہ کسی حال میں بھی اِن کو خوشی وخرم دیکھنا گوارا نہیں کر سکتے۔ اس مسئلے پر آپس میں برابر تبادلۂ خیال کرتے رہتے ہیں۔ آخر ایک دن انبالہ کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جیل میں آتا ہے اور اِن دونوں کو مخاطب کرتا ہے:

''اے باغیو! چوں کہ تم پھانسی کے خواہش مند ہو اور اس کو راہِ خدا میں شہادت سمجھتے ہو۔ ہم نہیں چاہتے کہ تم اپنی دلی مراد کو پہنچ کر خوشی سے ہمکنار ہوسکو، اس لیے ہم پھانسی کا حکم منسوخ کر کے تم کو جزائرِ انڈمان میں عمر قید کی سزا دیتے ہیں۔''

یہ حکم سنا کر حاکمِ ضلع چلا جاتا ہے۔ اسی کے اشارے سے ان دونوں کی داڑھیاں اور بال ترشوا دیے جاتے ہیں۔ اِس حال میں بھی یہ دونوں مگن ہیں۔ اس تبدیلی کو بھی منشائے الٰہی سمجھ کر وہ خوش ہیں۔ یہاں تک کہ داڑھی کے ترشے ہوئے بالوں کو ہاتھ میں اٹھا کر انھیں چومتے ہیں اور ان سے مخاطب ہوتے ہیں:

''میں خوش ہوں کہ تیرے ساتھ یہ سلوک اللہ کے راستے میں کیا گیا۔''

اس قیدِ بامشقت میں اِن سے ایسے ایسے سخت کام لیے جاتے ہیں، جنھیں کئی کئی آدمی بھی مل کر نہ کرسکیں۔ انجامِ کار پیشاب میں خون آنے لگتا ہے۔ لیکن اس حال میں بھی یہ صبر و استقامت کے پیکر خوش وخرم ہی نظر آتے ہیں۔ آخر کار چند ماہ کی محنتِ شاقہ کے بعد انھیں جزائر انڈمان منتقل کر دیا جاتا ہے۔

اِن کو جاتا ہوا دیکھ کر جیل خانے کے در و دیوار ان کو حسرت کی نظر سے تکنے لگتے ہیں اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں تو ان کی زبانِ حال سے نکلا ہوا یہ شعر فضا میں گونجنے لگتا ہے۔ ع

نہ رہا جنوں میں رُخِ وفا، یہ رسن یہ دار کروگے کیا
جنھیں جرمِ عشق پہ ناز تھا، وہ گناہ گار چلے گئے

۱۳۷۳ ہجری

''ارے ــــــ یہ لاہور ہے!!'' واقعات نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''شہر کا شہر سوگ میں ڈوبا ہوا ہے۔'' حالات نے بھی ادھر ادھر نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

''دیکھو نا ــــــ کوچہ کوچہ ڈگر ڈگر خاموش۔'' واقعات حیرت میں ڈوب جاتے ہیں۔

''ضرور کوئی اہم واقعہ پیش آیا ہے ــــــ ہر طرف اداسی ــــــ ہر طرف سناٹا۔'' تاریخ اپنی ویران نظریں چاروں سمت ڈالتے ہوئے کہتی ہے اور پھر اُس کے قدم انار کلی کی طرف اٹھ جاتے ہیں۔

آج معمول کے خلاف لوگ یہاں وہاں چار چار چھ چھ کی ٹولیوں میں کھڑے سرگوشیاں کرتے نظر آ رہے ہیں۔ تھوڑے ہی فاصلے پر چند سنجیدہ اور تعلیم یافتہ افراد کھڑے ہوئے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔ تاریخ جب ان کے قریب سے گزرتی ہے تو چند جملے اس کے کان میں بھی پڑ جاتے ہیں، جن کو سنتے ہی اس کے آگے بڑھتے ہوئے قدم رُک جاتے ہیں۔

''کچھ سنا تم نے؟'' وہ حالات سے مخاطب ہوتی ہے۔

''نہیں تو ــــ بات کیا ہے؟'' حالات کے استعجاب میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

''میں کہتی تھی نا ــــ کوئی اہم واقعہ پیش آیا ہے۔'' تاریخ کھوئے ہوئے انداز میں جواب دیتی ہے۔

''کیا ہوا ــــ ؟'' واقعات پھر سوال کرتے ہیں۔

''اقتدار کے نشے میں انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ دوست اور دشمن کو نہیں پہچان سکتا۔''
تاریخ کہتی رہی اور اس کے قدم خود بہ خود سنٹرل جیل کی طرف اُٹھ جاتے ہیں۔

''آپ کہاں جا رہی ہیں؟'' حالات تعجب کے ساتھ استفسار کرتے ہیں۔

''کیا تم نے نہیں سنا؟'' تاریخ بے خودی کے عالم میں بغیر رُکے ہوئے جواب دیتی ہے۔ ''کل سید ابوالاعلیٰ مودودی کو پھانسی کا حکم سنا دیا گیا ہے۔''

''پھانسی ـــ!'' دونوں رفیقوں کی زبان سے ایک ساتھ بے ساختہ نکل جاتا ہے۔

''ہاں ـــ ہاں ـــ پھانسی'' تاریخ اپنی ویران سی آنکھوں سے دونوں کو گھورنے لگتی ہے۔

وقت کا طاغوت جب دلائل کے میدان میں شکست کھا جاتا ہے تو پھر وہ بہتان تراشی کا سہارا لے کر اپنے مدمقابل کو راستے سے ہٹا دینے کی کوشش کرتا ہے۔

''کیا وہ اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہو جائیں گے؟'' حالات اضطراب کی حالت میں سوال کرتے ہیں۔

''اگر انھوں نے ایسا کیا تو اپنے تابوت میں ایک کیل اور ٹھونک لیں گے۔'' تاریخ خیالات میں ڈوبی ہوئی آگے بڑھتی جاتی ہے۔

اس کی نظروں کے سامنے سیکڑوں سال پہلے کا مسلمانوں ابتدائی دور گھومنے لگتا ہے۔
اُس کے ہونٹوں کو جنبش ہوتی ہے۔

''بہت دنوں کے بعد ع

پھر آندھیوں کی زد پہ، اندھیروں کے درمیاں
سنتے ہیں اک چراغ جلا دیکھتے چلیں

تاریخ کے قدم تیز تیز اٹھنے لگتے ہیں۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد سنٹرل جیل لاہور کا آہنی پھاٹک نظر آنے لگتا ہے۔ آج یہاں بھی سناٹا چھایا ہوا ہے، جیسے کسی کی موت ہوگئی ہو۔ بیرونی کھڑکی سے تاریخ جیل کے اندر داخل ہو جاتی ہے۔ ایک لمبی راہ داری طے کرنے کے بعد راستہ موٹی سیاہ چادر کے بھاری دروازے سے مسدود ہو جاتا ہے۔ اسے پار کر کے ان بیرکوں کا سلسلہ

شروع ہو جاتا ہے، جن میں ایسے ہی قیدی رکھے جاتے ہیں، جن کو اپنی زندگی کے آخری لمحات کا شدت سے انتظار ہوتا ہے۔ چند کوٹھریوں کے بعد وہ چھوٹا سا کمرہ ہے، جس میں دنیا کے بہت بڑے مفکر اور مفسر قرآن سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو رکھا گیا ہے۔ مولانا دروازے کی آہنی سلاخوں سے لگے ہوئے کھڑے ہیں۔ باہر آپ کے بڑے بھائی، صاحبزادے اور دوسرے رفقاے جماعت کھڑے ہیں، جو پھانسی کی دردانگیز اور وحشت ناک خبر پا کر ملنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ ہر شخص رنج وغم میں ڈوبا ہوا ہے۔ کسی کی آنکھیں سرخ ہیں، کسی کی پلکوں پر نمی ہے، کسی کے ہونٹوں پر خشک پپڑیاں جمی ہوئی ہیں۔ غرض یہ کہ ہر شخص اندوہ والم کا مجسمہ بنا ہوا ہے۔ البتہ جس چہرے سے اس نازک مرحلے میں بھی سکون وطمانیت ٹپک رہی ہے، وہ چہرہ ___ مولانائے محترم کا ہے۔ سلاخوں کے پیچھے کھڑا ہوا مردِ مجاہد اس وقت بھی عزیمت وجرأت کا پیکر معلوم ہوتا ہے۔

''مولانا ___ ! میں اپیل کے سلسلے میں آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ...''

قائم مقام امیر جماعت کا جملہ پورا بھی نہیں ہونے پاتا ہے کہ مولانا بول اٹھتے ہیں۔

''بھئی اِس سلسلے میں میرا مسلک تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ مجھے پھانسی پر لٹک جانا منظور ہے مگر کسی قسم کی کوئی اپیل کرنا مجھے گوارا نہیں۔''

''حق کی خاطر کیا انصاف کا دروازہ کھٹکھٹانا بھی مناسب نہیں؟'' پھر سوال کیا جاتا۔

''میں آپ سے دریافت کرتا ہوں، کیا اس جمہوریت کے دور میں حق کا اظہار کرنا بھی جرم ہے۔'' مولانا اپنے نرم اور مخصوص انداز میں سوال کرتے ہیں۔

''نہیں ___ یہ صرف دھاندلی ہے۔'' قائم مقام امیر جماعت جواب دیتے ہیں۔

''بس اسی سے سمجھ لیجیے۔ جب حاکم کی نیت خراب ہوتی ہے تو انصاف دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے۔'' مولانا نے بات پوری کر دی۔

''آپ درخواست نہ دیں ___ لیکن کم از کم ہمیں تو نہ روکیں۔'' پھر درخواست کی جاتی ہے۔

''میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اِس سرزمین پاکستان کے کتنے ضمیر ابھی زندہ ہیں، جو ظلم کو

ظلم کہنے کی ہمت رکھتے ہیں۔'' مولانا کے لہجے میں جذبات کی گرمی پائی جاتی ہے۔

''قوانینِ مملکت الہامی قوانین تو ہیں نہیں کہ ان کو چیلنج نہ کیا جا سکے ___ اور پھر جب کہ صریحاً ظلم ہو رہا ہو۔'' دوسرے انداز سے پھر وہی درخواست کی جاتی ہے۔

''بھئی! مجھے تو یہ پسند نہیں۔'' مولانا کے لہجے میں وہی استقامت جھلک رہی ہے۔

''آپ ہمارے حق سے ہمیں محروم کرنا چاہتے ہیں۔'' ایک نرالے انداز میں پھر وہی درخواست کی جاتی ہے۔

''نہیں ___ ایسا نہیں ہے ___ ہم تو جمہوریت کے لیے ایک سوالیہ نشان بننا چاہتے ہیں۔'' مولانا مسکراتے ہوئے جواب دیتے ہیں۔

''جیسی آپ کی مرضی۔'' آخر کار سپر ڈال دی جاتی ہے۔

''میں ظالم کو اس کی آخری حد تک پہنچانا چاہتا ہوں۔'' مولانا کی آواز پھر سنائی دیتی ہے۔ ''اس لیے میں نہیں چاہتا کہ میری طرف سے یا میرے خاندان کے کسی فرد کی طرف سے یا خود جماعت کے اندر یا باہر کسی کی طرف سے بھی کسی قسم کی کوئی درخواست پیش کی جائے۔''

''ان شاء اللہ اب ایسا ہی ہوگا۔'' قائم مقام امیرِ جماعت کی آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں، مگر لہجے سے ارادے کی پختگی کا اظہار ہو رہا ہے۔

''صرف اتنا ہی نہیں ___'' مولانا پھر خطاب فرماتے ہیں۔ ''بلکہ خواص کے سامنے کھل کر اظہارِ حق کیجیے تا کہ حجت تمام ہو جائے۔ عوام کو بدگمانیوں میں الجھا دیا گیا ہے، ان کے ذہنوں سے ان بدگمانیوں کو دور کرنے کی کوشش کیجیے، دین کے تقاضوں کی اہمیت ان کے دلوں میں بٹھائیے۔ رائے عامہ کو اسلامی نظام کے قیام کے لیے ہموار کیجیے۔ موت اور زندگی کے خدشات کو ذہنوں سے کھرچ پھینکیے۔''

مولانا کی انگلیوں کی گرفت دروازے کی آہنی سلاخوں پر بہت سخت ہو جاتی ہے۔ آنکھوں میں غیر معمولی چمک نمودار ہوتی ہے۔ مولانا چند سکنڈ خاموش کھڑے رہتے ہیں پھر فرمانا شروع کرتے ہیں:

''موت کا آنا برحق ہے، وہ ضرور آئے گی۔ مگر ـــــ صرف ایک بار۔ زندگی تیزی سے گزر رہی ہے، اُسے روکا نہیں جا سکتا، اور پھر ـــــ خدا کے حضور اس کے بارے میں جواب دہ ہونا ہے۔ دیکھیے کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہ ہونے پائے۔ طاغوتی طاقتوں کو ہنسنے کا موقع نہ ملے۔ اللہ سے مدد کی درخواست کیجیے اور رکاوٹوں کو دور کرنے میں تندہی سے کام لیجیے۔ یہاں تک کہ اگر ضرورت پڑے تو ؎

فراز دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

ملاقات کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ سپاہی چلنے کا اشارہ کرتا ہے۔ مولانا کے صاحبزادے عمر فاروق کی آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں۔ مولانا اپنا ہاتھ سلاخوں سے باہر نکالتے ہیں اور اُن کی پشت کو تسلی و تشفی کے لیے تھپتھپاتے ہوئے فرماتے ہیں:

''بیٹا ـــــ! ذرا نہ گھبرانا۔ اگر میرے پروردگار نے مجھے اپنے پاس بلانے کا فیصلہ فرما لیا ہے تو میں بہ خوشی تیار ہوں اور مجھے کوئی روک نہیں سکتا۔ لیکن اگر ابھی اس کا حکم نہیں ہے تو پھر چاہے یہ اُلٹے لٹک جائیں مگر مجھ کو نہیں لٹکا سکتے۔''

عمر فاروق وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی جواب نہ دے سکے اور سب کے ساتھ واپس ہونے لگے۔ کوٹھری کے در و دیوار زبانِ حال سے یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں ؎

یقیناً اِس تری جرأت کو دنیا یاد رکھے گی
سزائے موت سن کر بھی نہ پیشانی پہ بل آیا

یقین سے بھرپور مولانا کے یہ جرأت مندانہ کلمات سن کر تاریخ ششدر رہ جاتی ہے۔ وہ سر جھکائے غم میں ڈوبی ہوئی، جیل کے آہنی پھاٹک کی طرف بڑھنے لگتی ہے۔ اُس کے ذہن میں یہ شعر کروٹیں لینے لگتا ہے ؎

گر اِک چراغِ حقیقت کو گل کیا تم نے
تو موجِ دُود سے سو آفتاب ابھریں گے

سنہ ۱۳۷۴ ہجری

''دیکھو! یہی 'یمان طرہ' کا قید خانہ ہے۔'' ایک وسیع و عریض عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تاریخ حالات سے مخاطب ہوتی ہے۔

''اچھا ـــــ یہی وہ جیل ہے، جس میں اخوان کے سیکڑوں نوجوان زندگی اور موت کی درمیانی گھڑیوں کو گزار رہے ہیں۔'' حالات نے کہا۔

''ہاں، یہی وہ بدنام زمانہ جگہ ہے، جہاں دین و ایمان کی حفاظت جرم ہے۔'' تاریخ اپنے رفیقوں کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہوئے کہتی ہے۔ ''جہاں حق و صداقت کا نام لینا سب سے بڑا گناہ ہے۔''

چند منٹ کے بعد رائفلوں کے چلنے کی آواز سنائی دیتی ہے ـــــ تینوں چونک کر ٹھٹک جاتے ہیں۔

''سنا تم نے ـــــ؟'' ''اخوانیوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔'' تاریخ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوتی ہے اور پھر اس کے قدم تیزی کے ساتھ اُسی سمت کو بڑھنے لگتے ہیں جدھر سے گولی چلنے کی آواز آئی تھی۔ وہ تینوں بیرکوں سے گزرتے ہوئے اس میدان میں پہنچ جاتے ہیں، جو چاروں طرف بیرکوں سے گھرا ہوا ہے اور جس میں ہر طرف لاشیں ہی لاشیں تڑپتی نظر آ رہی ہیں ـــــ صحن میں لاشیں ـــــ کمروں کے سامنے لاشیں ـــــ زینے پر لاشیں ـــــ فرش تازہ خون سے تر بتر

ـــــ دیواروں کا نچلا حصہ خون سے رنگا ہوا۔ اس بھیانک اور ڈراؤنے ماحول میں چند فوجی افسر کھڑے 'رقصِ بسمل' کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔

لاؤڈ اسپیکر سے اعلان ہوتا ہے: ''ابھی آپ کے سامنے چند اخوانی اپنے پہلوانی کرتب پیش کریں گے۔'' اعلان ختم ہوتے ہی چند اخوانیوں کی ایک جماعت سامنے لائی جاتی ہے۔ یہ سب نیم برہنہ ہیں۔ پیچھے سے پولیس والے ان کی ننگی پیٹھوں پر کوڑے برساتے ہوئے انھیں آگے بڑھنے پر مجبور کر رہے ہیں جب کہ سامنے سے چند سپاہی ان کے چہروں پر کھولتا ہوا چونا پھینک رہے ہیں۔ ان بے چاروں کے لیے نہ آگے بڑھنا آسان اور نہ پیچھے ہٹنا ممکن۔ اسی مجبوری کی حالت میں تڑپ رہے ہیں اور بے ہوش ہو ہو کر گر رہے ہیں۔ وہی درندہ صفت انسان اِن کو تڑپتا ہوا دیکھ کر قہقہوں پر قہقہے لگا رہے ہیں۔ اِدھر ان مظلوموں کی بے کسی و بے بسی زبانِ حال سے انھیں متنبہ کر رہی ہے ع

نہ مسکراؤ مری بے بسی پہ اے تارو
تم اپنی خیر مناؤ کہ رات جاتی ہے

اِس وحشیانہ کرتب کے بعد عورتوں کی ایک جماعت کو لایا جاتا ہے۔ وہ بھی سب کی سب نیم برہنہ ہیں۔ ان کے ساتھ ایسی ایسی حیا سوز حرکتیں کی جاتی ہیں کہ جنھیں ضبطِ تحریر میں لاتے ہوئے قلم بھی شرم محسوس کر رہا ہے۔

اس کے بعد محی الدین عطیہ نامی ایک اخوانی کو آواز دی جاتی ہے۔ یہ لا کالج (Law College) کے طالبِ علم ہیں۔ اپنا نام سنتے ہی وہ بیرک سے نکل کر صحن میں آ جاتے ہیں۔ ان کا جسم بھی مختلف صعوبتیں برداشت کرتے کرتے داغ دار ہو گیا ہے۔ ایک سپاہی ان کے چھوٹے بھائی کو ان کے سامنے لاتا ہے اور سب کے سامنے اس کے ساتھ منہ کالا کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ حکم سنتے ہی تمام قیدیوں کے دل دہل جاتے ہیں، رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ محی الدین جو اَب تک سزائیں انتہائی صبر کے ساتھ برداشت کرتے رہے تھے، فرطِ الم سے رو پڑتے ہیں۔

''ایسا نہیں ہو سکتا۔'' محی الدین کی غم میں ڈوبی تھرتھراتی ہوئی آواز فضا میں ابھرتی ہے۔

لفظ ''نہیں'' کو سنتے ہی عرب جمہوریہ کا وزیر اعظم آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اس کا مضبوط چرمی کوڑا حرکت میں آتا ہے اور محی الدین کو اس کی غیرت اور انسانیت دوستی کا مزہ چکھانے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ غریب بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے۔

''اے اللہ! اپنے اس غیرت مند بندے پر رحم فرما، اسے اس ظلم سے نجات عطا فرما۔'' تاریخ کے ہونٹوں کو حرکت ہوتی ہے۔

دوسری طرف امورِ شمالی افریقہ سے متعلق عرب لیگ کے سابق مشیر اور اخوان المسلمون کی مجلسِ ارشاد کے رکن استاذ صالح ابو رفیق سپاہیوں کے جھرمٹ میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ فوجی افسر انھیں مادرزاد برہنہ ہونے کا حکم دیتا ہے۔

''کیوں ــــ؟'' استاذ صالح کی زبان سے نکل جاتا ہے۔

''یہاں وجہ دریافت کرنا جرم ہے۔'' افسر تلملا اٹھتا ہے۔ ''بغیر حیل و حجت کپڑے فوراً اتار دیے جائیں۔''

استاذ صالح تمام کپڑے اتار دیتے ہیں۔ ستر پوشی کے لیے مختصر سا کپڑا رہنے دیتے ہیں۔ یہ دیکھ کر افسر ایک سپاہی کو حکم دیتا ہے کہ ان کو بالکل برہنہ کر دے۔ استاذ صالح مزاحمت کرتے ہیں۔ بس پھر کیا ہے۔ ہر طرف سے کوڑے برسنے لگتے ہیں۔ جسم کی جلد جگہ جگہ سے پھٹ جاتی ہے۔ خون رِسنے لگتا ہے۔ استاذ بے ہوش ہو کر گر جاتے ہیں۔ ان کو اٹھا کر ایک ایسی تاریک کوٹھری میں ڈال دیا جاتا ہے جس میں ایک ایک بالشت ٹھنڈا پانی بھرا ہوا ہے۔ سردی کا موسم، ٹھنڈا پانی، زخمی جسم۔ ساری رات تڑپتے ہی گزر جاتی ہے۔ صبح ہوتے ہی ان کو ایک دوسرے کمرے میں لے جایا جاتا ہے، جس کی چھت سے دو موٹی موٹی لوہے کی زنجیریں لٹک رہی ہیں۔ دونوں کے آخری سرے پر ایک ایک آہنی کڑا بندھا ہوا ہے۔ سپاہی استاذ صالح کے پیروں کو جبراً ان کڑوں میں ڈال کر ان کو الٹا لٹکا دیتے ہیں اور پھر پاخانے کے مقام سے ان کے پیٹ میں ہوا بھرنا شروع کر دیتے ہیں یہاں تک کہ وہ پھول کر غبارہ ہو جاتے ہیں۔

''افسوس ــــ! انسانوں کے ساتھ یہ وحشیانہ برتاؤ۔'' تاریخ کی زبان سے بیساختہ نکل جاتا ہے۔

بربریت کے ان ناقابلِ برداشت مناظر کو دیکھ کر تاریخ کی آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں اور اس جابرانہ ماحول میں اسے دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے۔ وہ سر جھکائے لمبے لمبے قدم اٹھاتی ہوئی پھاٹک کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔ فضا میں گنگناہٹ پیدا ہوتی ہے۔ ع

ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں
ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں

۱۳۷۵ھ و ۱۳۸۶ھ

''زیادہ آگے نہ بڑھو۔ یہ پھانسی گھر ہے۔'' تاریخ حالات کو آگے بڑھنے سے روکتی ہے۔

''یہ کون آرہے ہیں جھومتے ہوئے زنجیروں میں جکڑے ہوئے؟'' واقعات تاریخ سے استفسار کرتے ہیں۔

''یہی تو وہ ہیں، جنھیں آج پھانسی دی جانے والی ہے۔'' تاریخ آنے والوں کو غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیتی ہے۔ ''دیکھو___! یہ عبد القادر عودہ ہیں، یہ یوسف طلعت ہیں، یہ ابراہیم الطیب ہیں اور باقی تینوں ان کے ساتھی ہیں۔''

تھوڑے سے وقفے کے بعد ان سب اخوانی لیڈروں کو تختہ دار پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ جاں باز___ مسکراتے اور کلمۂ شکر ادا کرتے ہوئے اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملتے ہیں۔ پھانسی کے وقت ان کی زبانوں سے نکلے ہوئے آخری کلمات فضا میں ارتعاش پیدا کر رہے ہیں۔

''خدا مجھے معاف کرے اور ان لوگوں کو بھی، جنھوں نے مجھ پر مظالم ڈھائے ہیں۔''

''خدایا___! تو ہی عظیم ہے اور بزرگی و برتری تیری ہی لیے ہے۔''

''میں خوش ہوں کہ مسلمان کی حیثیت سے جامِ شہادت نوش کر رہا ہوں۔''

''ظالم اور مظلوم دونوں___ کل خدا کے روبرو پیش ہوں گے۔''

''موت مومن کے لیے اللہ کی ملاقات کا ایک ذریعہ ہے۔''

بے حس و حرکت پڑے ہوئے لاشے، جیسے زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں ع

ہم نبضِ جفا کی گرمی کو اے ظلم پر کھنے آئے تھے
قانون کے سرخ انگاروں پر ہم ہاتھ کو رکھنے آئے تھے
آخون لگادیں ہم اپنا اے مصر ــ تری پیشانی پر
تجھ کو تو ابھی رونا ہے بہت اس محفل کی ویرانی پر

تاریخ کانوں پر ہاتھ رکھے ہوئے غم واندوہ کی تصویر بنی ہوئی اپنے رفیقوں کے ساتھ پھاٹک کی طرف تیزی سے بڑھتی ہے تاکہ جلد از جلد اس ڈراؤنے ماحول سے دور بہت دور ہو جائے۔

لیکن ــ یہ کیا ــ !!

کس بدنصیب کو جیل کے پھاٹک میں ٹھونسا جا رہا ہے، جو بخار کی شدت کی وجہ سے نیم بے ہوشی کی حالت میں ہے اور جسے خود سے قدم اٹھانا بھی مشکل ہو رہا ہے ــ یہ پولیس کے کارندے چیل اور کوّوں کی طرح اس پر کیوں ٹوٹ پڑے۔

اُف ــ اس حالت میں بھی اُسے اِس بری طرح زدوکوب کر رہے ہیں۔

ارے ــ یہ تو سیّد قطب ہیں ــ اخوان کے دماغ، دینِ حق کے علمبردار ــ الحاد پرستوں اور لادینی تحریکوں کی آنکھوں میں کھٹکتے ہوئے کانٹے ــ اللہ توبہ ــ یہ بھیڑیا نما کتاّ سید قطب کی ایک ٹانگ منہ میں دبائے ادھر ادھر اُنھیں گھسیٹتا پھر رہا ہے ــ جب کچھ ہوش آ جاتا ہے تو آپ کی زبان سے یہ کلمات نکلتے ہوئے سنائی دیتے ہیں:

اَللّٰہُ اَکبَرُ وَلِلّٰہِ الحَمدُ

اس کے بعد آپ کو لے جا کر ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جہاں روزانہ آپ کو نت نئے ڈھنگ سے تکلیفیں پہنچائی جاتی ہیں۔ کبھی آپ کے سر پر مسلسل گرم پانی ڈالا جاتا ہے تو کبھی برف جیسا ٹھنڈا پانی۔ کبھی لاتوں اور گھونسوں سے مدارات کی جاتی ہے تو کبھی گندے اور دل آزار کلمات کے ذریعے آپ کی غیرت کو چیلنج کیا جاتا ہے۔ مگر ان ساری آزمائشوں کے جواب میں صبر وشکر کا رویہ آپ کے ایقان واذعان میں اضافہ ہی کرتا رہتا ہے اور عزیمت کے قدموں میں غیر معمولی جماؤ پیدا ہوتا جاتا ہے۔

اسی طرح پندرہ سالہ قیدِ بامشقت کا ایک سال ختم ہو جاتا ہے۔ آپ اپنی کوٹھری میں سر جھکائے بیٹھے ہیں کہ جمال عبدالناصر والیِ مصر کا نمایندہ داخل ہوتا ہے اور پیش کش کرتا ہے:

''اگر آپ چند سطریں معافی نامے کی لکھ دیں تو آج ہی آپ کو جیل کے مصائب سے نجات مل سکتی ہے۔''

مردِ مومن سر اٹھا کر نمائندے کو غور سے دیکھتا ہے اور پھر باوقار انداز میں جواب دیتا ہے:

''مجھے ان لوگوں پر حیرت ہے، جو مظلوم سے کہتے ہیں کہ ظالم سے معافی مانگ لے۔ خدا کی قسم، اگر معافی کے چند الفاظ مجھے پھانسی سے بھی نجات دلا سکتے ہوں تب بھی میں باطل سے بھیک مانگنے کے لیے تیار نہیں۔ میں اپنے رب کے حضور اس حال میں پیش ہونا پسند کروں گا کہ میں اس سے خوش ہوں اور وہ مجھ سے راضی ہو۔''

ناصر کا نمایندہ اپنا سا منہ لیے ہوئے واپس چلا جاتا ہے۔

''ارے، یہ کون چیخ رہا ہے؟'' حالات تاریخ کو متوجہ کرتے ہیں۔

''شاید عورتوں کو ابتلا کی بھٹی میں تپایا جا رہا ہے۔'' تاریخ درد بھرے انداز میں جواب دیتی ہوئی اُسی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔

وہ دیکھیے ــــ سامنے ہی نیم برہنہ عورتوں پر کوڑوں کی بارش ہو رہی ہے اور چند عورتیں تو چوبی ٹکٹکی سے کسی ہوئی ہیں۔ ان کے بدن زخموں سے چور چور ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زخموں کی بہار آئی ہوئی ہے، جن میں سے بہتے ہوئے لہو اور پیپ کا تعفن دور سے گزرنے والوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ ایک اخوانی قیدی انجینئر سے عورتوں کی یہ بے عزتی اور بے پردگی برداشت نہ ہوئی۔ وہ اپنی قمیص اتار کر اپنی دینی بہنوں کی ستر پوشی کی غرض سے ان کی طرف پھینک دیتا ہے۔ قمیص ابھی عورتوں کے پاس پہنچنے بھی نہیں پاتی ہے کہ فائر کی آواز سنائی دیتی ہے اور وہ غیرت مند انجینئر اسی جگہ گر کر تڑپنے لگتا ہے۔

ایک اور خاتون، جو بڑی صاحبِ علم و فضل ہیں اور تبلیغ کے میدان میں بڑی سرگرمِ عمل

رہی ہیں، سامنے کھڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کے بھائی کو ان کی آنکھوں کے سامنے طرح طرح کی وحشیانہ سزائیں دی جارہی ہیں۔ اس عمل کو دہراتے ہوئے بیس دن گزر چکے ہیں۔ بھائی سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ "اِس بات کی تحریر دے دو کہ تمھاری یہ بہن، جو نظر بند ہے، بدکار اور پیشہ ور ہے۔"

"کسی پر بہتان لگانا بہت بڑا گناہ ہے۔" نحیف مگر عزم سے بھرپور آواز سنائی دیتی ہے: "یہ میں کیسے لکھ دوں۔ کل اللہ کے سامنے کیا جواب دوں گا۔"

نفی میں جواب ملتے ہی کوڑوں کی سنسناہٹ فضا میں گونجنے لگتی ہے۔ اس کے بعد اسے بجلی کا جھٹکا دیا جاتا ہے۔ وہ غریب تڑپنے لگتا ہے۔ بہن سے جب یہ اذیت دیکھی نہ گئی تو وہ بھائی سے التجا کرتی ہے:

"بھائی جان! جیسی یہ چاہتے ہیں ویسی تحریر لکھ کر دے دیجیے۔ کسی طرح اِس اذیت سے اپنے آپ کو بچا لیجیے۔"

"ہمشیر! تم میرے لیے بہترین نمونہ ہو۔" قیدی آنکھیں کھول کر بہن کی طرف دیکھتا ہے۔ "میں بھی ان شاءاللہ تمھارے لیے بہترین نمونہ بنوں گا۔"

وہ پھر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ لحہ بہ لحہ کمزوری بڑھتی جا رہی ہے۔ اُس کی پست ہوتی ہوئی نظریں گویا زبانِ حال سے کہہ رہی ہوں ؏

دار کی حدوں پہ بھی جذبِ دل نہ رُک سکا
موت دیکھتی رہی، زندگی گزر گئی!

بھائی کی یہ حالت دیکھ کر بہن کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے ہیں۔ وہ اُسے سہارا دینا چاہتی ہے مگر ایسا کر نہیں سکتی کیوں کہ وہ مجبور ہے، بے بس ہے۔ آخر کار وہ خود بھی آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ وہ اس جگہ سے ہٹ بھی نہیں سکتی کیوں کہ اُسے یہیں کھڑے رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان کی مظلومیت چیخ کر اعلان کرتی ہے ؏

ظالمو! گردشِ ایام تمھیں یاد رہے
شاہِ فاروق کا انجام تمھیں یاد رہے

دوسری طرف کوٹھری نمبر ۴ میں شوقی عبدالعظیم چھت سے اُلٹے لٹکے ہوئے ہیں۔ جسم بالکل برہنہ ہے۔ چھت پر ایک ٹونٹی لگی ہوئی ہے، جس سے پٹرول کے قطرے شوقی کے سر پر گر رہے ہیں۔ اس سے ان کی سانس گھٹنے لگتی ہے۔ یہ عمل یکم رمضان سے مسلسل پانچ گھنٹے روزانہ کیا جارہا ہے۔ داروغہ جیل بار بار آکر ان سے سوال کرتا ہے:

''کیا تم اب بھی اپنے اصولوں سے منحرف نہیں ہو سکتے؟''

''اے اللہ! اگر تو مجھ سے ناراض نہیں تو پھر ان مصائب کی میرے لیے کوئی حیثیت نہیں۔''

شوقی کا یہ بالواسطہ نفی میں جواب سن کر داروغہ غصے سے تلملا اٹھتا ہے اور اسی جھنجلاہٹ میں وہ اپنا جلتا ہوا سگریٹ شوقی کے جسم سے بجھاتا ہے اور پھر کوڑوں سے مدارات شروع کر دیتا ہے۔ کوڑوں کی سنسناہٹ سے صاف یہ آواز سنائی دیتی ہے۔ ع

منزلِ دار و رسن ہو کہ سوادِ زنداں
عشق ہر حال میں پابندِ رضا ہوتا ہے

تاریخ مہر بہ لب آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے لڑکھڑاتی ہوئی آگے کی طرف بڑھتی ہے۔ سامنے سے ایک باوقار اور پر عزم انسان سپاہیوں کے نرغے میں آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جسم نحیف و لاغر لیکن متناسب، پیشانی سے پھوٹتی ہوئی نور کی کرنیں، چہرے پر بحالی اور عمومی مسکراہٹ۔ یہ وہی سید قطب ہیں، جن کی پندرہ سالہ قید بامشقت بغیر وجہ بتائے ہوئے منسوخ کر دی گئی تھی اور جنھیں اب سوچی سمجھی اسکیم کے تحت بغاوت کے الزام میں ماخوذ کر کے پھانسی کی سزا دی گئی ہے۔ آج ان کی پھانسی کا دن ہے۔ ان کو پھانسی گھر کی طرف لے جایا جارہا ہے۔ ان کے قدم پورے عزم واستقلال کے ساتھ تختۂ دار کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ان کی پامردی اس بات کا اعلان کر رہی ہے کہ ع

یہ قید و بند، یہ دار و رسن، یہ زنجیریں
سمندِ عزمِ مسلماں کو روک دیں کیوں کر

پھانسی گھر کے در و دیوار عالمِ سکوت میں کھوئے ہوئے ہیں، ہر طرف سنّاٹا چھایا ہوا ہے۔ فضا غم انگیز ہے۔ ماحول رنج و الم میں ڈوبا ہوا ہے۔ فرشتے گڑگڑا رہے ہیں ع

کب آئے گی گردش میں تو اے موجِ مکافات
کب ڈوبے گا ظلم اور ستم کا یہ سفینہ

مردِ مومن خندہ پیشانی کے ساتھ بڑھتا ہوا تختۂ دار پر پہنچ جاتا ہے۔ اس کی نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔ ہونٹ ہلنے لگتے ہیں۔

''اے میرے رب! میری کوتاہیوں کو معاف فرما اور میرے اس وطن میں اپنے دین کو غالب فرما۔''

ادھر دعا کے کلمات پورے ہوتے ہیں کہ اُدھر جسم و روح کا رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو جاتا ہے۔

تاریخ کے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے۔ اس کے چہرے سے وحشت ٹپکنے لگتی ہے۔ وہ دیوانہ وار جیل کے پھاٹک کی طرف بھاگتی ہے۔ باہر آتے ہی وہ لڑکھڑا کر گر جاتی ہے۔ انسانیت مجسم سوگ بنی ہوئی اس کے پاس آتی ہے اور اُسے جھنجھوڑنے لگتی ہے۔

''تم یہاں کیوں پڑی ہو۔ اب یہاں کیا رکھا ہے؟''

''میں بہت تھک گئی ہوں۔'' تاریخ سر اٹھا کر انسانیت کو بہ غور دیکھتے ہوئے جواب دیتی ہے۔ ''سالہا سال سے داعیانِ حق کے ساتھ اہلِ باطل کا یہ تشدد آمیز رویہ دیکھتے دیکھتے میرا ذہن ماؤف ہو رہا ہے۔ مجھے تھوڑی دیر آرام کر لینے دو۔''

''تم نے نہیں محسوس کیا کہ اہل باطل کی یہ بوکھلاہٹ، جس نے تشدد کی شکل اختیار کر لی ہے، کس بات کی غمازی کر رہی ہے۔'' انسانیت تاریخ سے دریافت کرتی ہے۔

''تم ہی بتاؤ، میں تو اس وقت کچھ بھی نہیں سوچ سکتی۔'' تاریخ اپنی ویران آنکھوں سے انسانیت کو گھورتے ہوئے جواب دیتی ہے۔

''حق پرستوں کی مسلسل اور اَن تھک کوششوں میں اہلِ باطل کو اپنی موت بڑھتی ہوئی

نظر آ رہی ہے۔'' انسانیت بہت ہی پُر امید انداز میں تاریخ کو سمجھاتی ہے۔

''لیکن یہ راستہ بہت خاردار ہے۔ اس پر چلنا کوئی آسان کام نہیں ع

اُف یہ جادہ کہ جسے دیکھ کے جی ڈرتا ہے
کیا مسافر تھے جو اس راہ گزر سے گزرے

تاریخ گہرے سوچ میں ڈوبی ہوئی، فضا کو گھورتے ہوئے جواب دیتی ہے۔

''اس میں کیا شک ہے۔'' انسانیت تاریخ کی تائید کرتے ہوئے کہتی ہے۔ لیکن ع

گو منزل ہے دشوار بہت، گو رَستے ہیں پُر خار بہت
ہو ذوقِ چمن کاری دل میں، تو پھولوں کے انبار بہت

''آخر تم چاہتی کیا ہو؟'' تاریخ جماہی لیتے ہوئے انسانیت سے سوال کرتی ہے۔

''وہ دیکھو، مشرق کی طرف صبح کے آثار نظر آ رہے ہیں۔'' مشرق سے اُبھرنے والی ہلکی ہلکی روشنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انسانیت نے کہا۔

تاریخ مشرق کی طرف نظریں جما کر دیکھنے لگتی ہے۔ انسانیت اُسے سہارا دیتی ہے۔ وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں سے دبائے ہوئے اُٹھتی ہے اور انسانیت کے ساتھ ساتھ مشرق کی سمت روانہ ہو جاتی ہے۔ ایک گنگناہٹ سی فضا میں سنائی دیتی ہے ع

سیاہ رات کی تاریکیوں کے رکھوالو
طلوعِ مہرِ جہاں تاب کون روکے گا

—•○•—